۷ مارچ ۱۹۷۱ء



ہم ملک کی سالمیت
کے لئے ہر قربانی دینے
کو تیار ہیں
بھٹو :

مغربی پاکستان کے صوبے
اپنے لئے چھ نکات میں
ترمیم کر سکتے ہیں
مجیب :

پاکستان کی تاریخ کا سب سے بڑا سوالیہ نشان ۳ مارچ ؟

کسے معلوم ۳ مارچ کو کیا ہوگا

(ملاحظہ کیجئے صفحہ ۱۳ پر)

قیمت مغربی پاکستان میں ۶۰ پیسے ، مشرقی پاکستان میں ۷۵ پیسے

ہفت روزہ
لیل و نہار
کراچی

جلد ۲	یکم تا ۷ مارچ ۱۹۷۱ء	شمارہ ۹

ادارہ تحریر

فیض احمد فیض ——— حسن عابدی
امین مغل لاہور ——— احمد الیاس ڈھاکہ





فون نمبر ——— ۴۱۲۴۹۰

قیمت

مغربی پاکستان میں ——— ۶۰ پیسے
مشرقی پاکستان میں ——— ۷۵ پیسے
گوادر - پسنی میں ——— ۰ پیسے
برطانیہ میں ——— ۱۴ نئے پنس

پوسٹ بکس ۳۱۷۸ - کراچی ۲۹

ایشیا میں جنگ کی آگ

اسوقت، جبکہ ہماری نظریں ملک کے بعض اہم داخلی امور پر لگی ہوئی ہیں، ایک اور خطرہ ہے، جو گھر کے قریب دستک دے رہا ہے۔ یہ لاؤس میں امریکی سامراجی فوجوں کی جارحانہ پیشقدمی ہے۔ نپام بموں کی بوچھاڑ اور ٹینکوں کی یورش میں آتش و آہن کا ایک خونیں سیلاب ہے، جو پورے ہند چینی کو روندتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ سامراجیوں کی یہ مداخلت کس وقت پورے ایشیا کو اپنی لپیٹ میں لے لے بلکہ دنیا کا امن تہہ و بالا ہوجائے۔

امریکہ کے جنگجو فرمانرواؤں نے انسان کے لہو سے زر و مال کی کشید کا سامان یوں تو پورے ایشیا اور مشرق اوسط میں کر رکھا ہے لیکن جنوب مشرقی ایشیا میں یہ عمل زیادہ وسیع پیمانے پر اور سامراجی فوجوں کی براہِ راست نگرانی میں ہو رہا ہے۔ نیک دل اور صلح جو ایشیائی عوام کی بستیاں جو امن و آشتی کا مسکن تھیں، جنگ کا میدان بنی ہوئی ہیں۔ امریکی جنگ بازوں کے ایشیائی حلیف، جو اُن کے سامراجی مفادات کے نگراں ہیں ہموطنوں کا گلا کاٹنے کے لئے اپنے غیر ملکی آقاؤں کے اشارے پر چل رہے ہیں۔

امریکہ کے صدر نکسن نے چند روز قبل ایک پریس کانفرنس میں شمالی ویت نام کی حکومت کو متنبہ کیا تھا کہ شمالی علاقے پر "لامحدود پیمانے" پر بمباری کی جائے گی۔ انہوں نے اس امکان کی بھی تائید کی کہ شمالی ویت نام پر جنوب کی فوجیں حملہ آور ہوں گی۔ ادھر کمبوڈیا اور پھر لاؤس میں جارحیت کا سلسلہ پہلے ہی پوری شدت سے جاری ہے۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے؟ وہ کون سا بین الاقوامی قانون یا اقوامِ متحدہ کا وہ کون سا ضابطہ ہے، جس کے تحت امریکہ کو یہ اختیار سپرد ہوا ہے کہ وہ ہزاروں میل دور ایشیا کی سرزمین پر اپنی فوجیں لے کر آدھمکے اور علاقائی تحفظ کی ذمہ داری کے تحت پہلے ویت نام کو تخت و تاراج کرے پھر حریت پسندوں کے خلاف انتقامی کارروائی کے لئے کمبوڈیا میں فوجی مداخلت کرے اور اس علاقے کو تباہ و برباد کرنے کے بعد لاؤس پر حملہ کر دے کیونکہ شاہراہ ہوچی منہہ کی ناکہ بندی حریت پسندوں کے محاصرے کے لئے بیحد ضروری ہے اور امریکہ یہ حق رکھتا ہے کہ ویت نام میں اپنے جارحانہ تصرف کی خاطر جہاں چاہے اور جب چاہے حملہ کر دے۔ سوال یہ ہے کہ دنیا کا وہ کون سا قانونی یا اخلاقی اصول ہے، جس کے تحت امریکہ، خدائی فوجدار بن کر، دنیا بھر میں اپنی فوجیں بھیجنے اور اسلحہ استعمال کرنے کا حق رکھتا ہے؟ ظاہر ہے کہ ان مجرمانہ اور مجنونانہ کارروائیوں

کی تائید کسی بھی قانونی یا اخلاقی ضابطے سے نہیں ہوتی۔ ایشیا کی سرزمین میں یہ مہیب اور بے پایاں تباہ کن کارروائیاں، یہ لرزہ خیز بربادی اور خونریزی جس کی مثال انسان کی متمدن تاریخ میں نہیں ملتی، محض اس لئے ہے کہ امریکہ، ایشیا میں، اپنے سامراجی مفادات سے دستبردار ہونے کے لئے آمادہ نہیں، اسکی سامراجی معیشت اور اس کے مردم خور سرمایہ داروں کی سیاست کا بنیادی تقاضہ بھی یہ ہے کہ جنگ جاری رہے۔ جنگ ایشیا میں ہو، جنگ مشرقِ وسطیٰ میں ہو، جنگ افریقہ میں ہو۔ اسلحہ کی مانگ بڑھتی رہے، جدید آزمادہ نو آزاد اقوام، خاک و خون میں تڑپتی رہیں اور اُن کی دولت، سامراج کی صنعتی اور تجارتی مصلحتوں کے کام آتی رہے۔

طُرفہ ستم یہ ہے کہ امریکہ کے جنگ باز حکمراں اپنے سامراجی مقاصد کی تکمیل کے لئے نہ صرف یہ کہ بین الاقوامی اصولِ آداب کی پرواہ نہیں کرتے بلکہ اِن معاہدوں اور وعدوں کو بھی نہایت بے شرمی سے نظرانداز کر دیتے ہیں جن میں خود ان کی حیثیت بالادست فریق کی ہوتی ہے۔ ۱۹۶۲ء کے معاہدۂ جنیوا میں لاؤس کی غیر جانبدار حیثیت خود امریکہ نے تسلیم کی تھی لیکن اس نے اپنے رویّے سے یہ ثابت کر دیا کہ جب ویت نام میں آگ لگی ہو تو اسکی سرحدیں لپکتے ہوئے شعلوں سے محفوظ نہیں رہ سکتیں، چنانچہ امریکی فوجوں نے لاؤس کی غیر جانبداری کا احترام ایک دن بھی نہیں کیا۔ جنوبی ویت نام کی فوجیں، امریکی بمبار طیاروں کی آڑ لے کر لاؤس پر بظاہر آج حملہ آور ہوئی ہیں اور معاہدۂ جنیوا کی دھجیاں آج اُڑتی ہوئی نظر آتی ہیں، لیکن یہ جارحانہ روش تو بہت پرانی ہے اور اسکی پردہ پوشی تو خود امریکہ کے اربابِ اقتدار نے بھی نہیں کی۔ ۱۹۶۹ء میں امریکی حکام نے سینیٹ کی امورِ خارجہ کمیٹی کے روبرو یہ اعتراف کیا تھا کہ ہند چینی میں امریکی فوجوں کی مداخلت کبھی بند نہیں ہوئی۔ البتہ الزام ہر مرتبہ شمالی ویت نام پر ڈالا گیا۔ اسی طرح ہوچی منہہ شاہراہ اور نواح کے علاقوں پر امریکی فضائیہ کی بمباری کا سلسلہ پچھلے سات آٹھ برس سے جاری ہے۔ لاؤس کے حریت پسندوں اور عام شہریوں کو اس ارادے سے ہدف بنایا جاتا ہے کہ امریکہ جنگ کا دائرہ وسیع کر کے اس پورے علاقے کو اپنے تصرف میں لینا چاہتا ہے تاکہ ایشیا میں اپنے پنجے مضبوطی سے گاڑ سکے۔

کمبوڈیا کی طرح لاؤس میں بھی امریکی فوجوں کے حملے کا اصل مقصد وہاں کی نامقبول حکومتوں کو سہارا دے کر حریت پسندوں کی پیشقدمی کو روکنے کے لئے انہیں تیار کرنا ہے۔ لاؤس کی حریت پسند تنظیم "پیتھیٹ لاؤ" کے یقینی اثر سے امریکہ سخت خوفزدہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کمبوڈیا میں حملے کے وقت، جہاں اُس نے ویت کانگ کی "پناہ گاہیں" ختم کرنے کا عُذر تراشا تھا، وہیں لاؤس میں حملے کے موقع پر اس نے ہوچی منہہ شاہراہ کی ناکہ بندی کا "عذر" پیش کیا ہے۔ یہی وُہ جارحانہ طریق استدلال ہے، جس کے تحت امریکہ شمالی ویت نام پر حملے کو بھی "جائز" قرار دیتا ہے، اس کے بعد ظاہر ہے کہ عوامی جمہوریہ چین پر حملے اور ایک خوفناک عالمی جنگ کے درمیان کتنا فاصلہ رہ جاتا ہے۔

امریکی صدر نکسن نے، برسرِ حکومت آنے سے پہلے ۱۹۶۴ء میں، ویت نام کی جنگ کے سانحہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ امریکہ یہ لڑائی ہار رہا ہے، کیونکہ اس کی پالیسی دفاعی نوعیت کی ہے اور پہل قدمی کی اہلیت سے خالی ہے۔ اس وقت انہوں نے کہا تھا کہ امریکہ کے سامنے چارۂ کار یہی رہ گیا ہے کہ یا تو جنگ جیت لے، ورنہ آئندہ ایک وسیع تر جنگ کے لئے تیار رہے۔ صدر نکسن نے برسرِ حکومت آنے کے بعد اس دوسرے طریقِ کار کا انتخاب کیا ہے۔ لیکن اس کا انجام بھی امریکہ کے لئے ناکامی، تباہی اور ذلت کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ ایشیا اور افریقہ کی بیدار قومیں اور دُنیا بھر کے امن پسند عوام اب پہلے سے کہیں زیادہ متحد، منظم اور بااختیار ہو چکے ہیں اب قوموں کی آزادی اور مُلکوں کی سلامتی کے فیصلے، امریکی جنگ بازوں کی صوابدید کے تحت نہیں بلکہ حریت پسند عوام کی اپنی خواہشات کے مطابق فیصل ہوں گے۔

احوالِ وطن

ڈاک کی ہڑتال ⁘ یہ نازک صورتحال ختم ہو سکتی ہے

یوں تو ہڑتال اور سرمایہ دارانہ معیشت کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں سرکاری اور نیم سرکاری اداروں میں آئے دن جو ہڑتالیں ہوتی ہیں، وہ زیادہ تر انتظامیہ کے غیر مصالحانہ رویئے کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اکثر و بیشتر ملازمین کے معمولی مطالبات کو بھی ماننے سے انکار کر کے انتظامی مشینری عمداً ملازمین کو ہڑتال پر اکساتی ہے اور پھر ہڑتال کا سہارا لے کر انہیں انتقامی کارروائی کا نشانہ بناتی ہے۔

۱۸ فروری سے مشرقی پاکستان کے ساٹھ ہزار ڈاکیوں نے غیر معیّنہ مدت تک کے لئے ہڑتال کر دی ہے جو تادم تحریر جاری ہے۔ ڈاک کے ملازمین کے مطالبات میں عبوری امداد قومی تنخواہ کمیشن کی سفارشات کی اشاعت اور ان پر عملدر آمد کے مطالبے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ڈاکیوں کی یونین کے رہنماؤں کا کہنا ہے کہ یہ ہڑتال کسی نئے مطالبے کی بنیاد پر نہیں کی گئی بلکہ ۱۹۶۹ء میں انتظامیہ نے جو مطالبات تسلیم کر لئے تھے ان پر آج تک عملدر آمد نہ ہونے کیوجہ سے مجبوراً انہیں یہ انتہائی قدم اٹھانا پڑا ہے۔ ہڑتالی مزدوروں کا کہنا ہے کہ ۱۸ تاریخ سے قبل ہم نے بات چیت کے ذریعہ معاملات کو سلجھانے کی پوری کوشش کی لیکن انتظامیہ نے سرے سے بات چیت سے ہی انکار کر دیا۔

پاکستان کے سرکاری اور نجی اداروں میں یہ رجحان ایک متعدّی مرض کی طرح پھیل رہا ہے کہ ہڑتال ختم کرانے کے لئے مزدوروں کے کچھ مطالبات تسلیم کر لئے جاتے ہیں جن پر باضابطہ محکمۂ لیبر کے حکام کی موجودگی میں معاہدے پر دونوں فریقوں کے دستخط ہوتے ہیں۔ لیکن جوں ہی مزدور کام پر واپس آ جاتے ہیں تسلیم کئے ہوئے مطالبات پر عملدر آمد کے بجائے سرگرم مزدوروں کے خلاف انتقامی کارروائیوں کا آغاز ہو جاتا ہے۔ نجی اداروں کا جہاں تک تعلق ہے حکومت ان کے مالکان کے رویّے کی ذمہ داری قبول کرنے سے بچتے ہوئے (جو قطعی عذر لنگ ہے) خود کو غیر جانبدار بنائے رکھنے کی کوشش کرتی ہے لیکن سرکاری اداروں کی انتظامیہ کا اپنے تحریری معاہدوں سے پھر جانا خود حکومت کا اپنے تحریری معاہدوں سے پھر جانے کے مترادف ہے اس مسئلہ پر متعلقہ حکام اپنی غیر جانبداری یا معذوری کا کوئی جواز نہیں پیش کر سکتے۔

ہڑتالوں کے سلسلے میں سرکاری نیم سرکاری اور نجی اداروں کا ایک ناقابل فہم رویہ یہ بھی ہے کہ مزدوروں کے مطالبات تسلیم کرنے سے جتنے زائد مصارف انہیں ادا کرنے پڑتے ہیں۔ اس سے کئی گنا زیادہ رقم کا نقصان (جو ہڑتال کی طوالت سے ہوتا ہے) انہیں منظور ہے لیکن مزدوروں کے جائز مطالبات تسلیم کرنے سے انکار ہوتا ہے۔ ایسے موقعوں پر انتظامیہ اپنے غیر مفاہمانہ رویہ کو وقار کا مسئلہ بنا کر نہ صرف غریب مزدوروں اور ملازموں کے لئے مصیبتوں کے دروازے کھول دیتی ہے بلکہ ملکی معیشت کو بھی اپنی بے جا ضد سے نقصان پہنچاتی ہے۔ یہ ساری دھاندلیاں اربابِ حکومت کی ناک کے عین نیچے ہوتی ہیں لیکن یہ لوگ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی انجان بنے رہتے ہیں۔

مشرقی پاکستان میں ۶۰ ہزار ڈاکیوں کی ہڑتال سے جہاں ملازمین اور حکومت دونوں کا نقصان ہو رہا ہے وہیں عوام کو بھی بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے مشرقی پاکستان کے ڈاک خانوں میں ڈاک کے انبار لگ گئے ہیں۔ انصار اور پولیس کے ذریعہ ڈاک کی تقسیم کے نظام کو جاری رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ لیکن نوے فیصد ڈاک ڈاکخانوں میں پڑی رہتی ہے اس کے باوجود متعلقہ حکام اپنی ضد پر اڑے ہوتے ہیں انہیں حکومت کا نقصان اور عوام کی مشکلات منظور ہیں لیکن ملازمین کے مطالبات (جنہیں وہ خود تسلیم کر چکے ہیں۔) منظور نہیں۔

مشرقی پاکستان کے ہڑتالی ڈاکیوں کی حمایت جہاں مزدور تنظیموں نے کی ہے وہیں مغربی پاکستان کے ڈاکیوں نے یہ دھمکی دی ہے کہ اگر مشرقی پاکستان کے ڈاک ملازمین کے مطالبات جلد تسلیم نہ کئے گئے تو ان کی عملی حمایت کے طور پر وہ خود بھی ہڑتال کر دیں گے۔ اب اگر مغربی پاکستان میں بھی ڈاک کے ملازمین ہڑتال پر چلے جائیں تو جو نازک صورت حال پیدا ہو جائے گی اس کا اندازہ کرنا زیادہ مشکل نہیں اور یہ سب کچھ محکمۂ ڈاک کے خودسر حکام کی ضد کا نتیجہ ہوگا۔

قومی زندگی کے اس نازک مرحلہ میں جب کہ دستور سازی جیسے اہم مسئلہ پر سیاسی پارٹیوں اور کارکنوں میں پہلے ہی سے کافی تناؤ پایا جاتا ہے۔ نوکر شاہی کے رویّہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ملک کی سیاسی صورت حال کو بہتر بنانے کے بجائے اسے خراب تر کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ آئینی حکومت کے قیام سے عوام کو کسی حد تک جمہوری آزادی مل جائے گی اور اس آزادی کو استحصالی طبقہ اپنی تباہی سمجھتا ہے۔

حکومت کو چاہئے۔ ان بدگمانیوں کے ازالے کی خاطر موجودہ بے چینیوں کے اسباب دُور کرے اور ڈاک کے ملازموں کے مطالبات تسلیم کر لے۔

یہ لوگ مجھے جینے نہیں دیتے

"یہ لوگ مجھے جینے نہیں دیتے مجھے مرجانا چاہیئے"

نوجوان اخبار فروش محمد انور نے یہ کہا اور اپنے کپڑوں میں آگ لگا کر خودکشی کر لی۔ میٹھادر کے تھانے میں پولیس کھڑی تماشہ دیکھتی رہ گئی۔ محمد انور کو شکایت بھی پولیس سے ہی تھی، جس کے بعض اہل کار اسے طرح طرح سے تنگ کرتے اور فٹ پاتھ پر اخبار بیچنے کی اجازت نہیں دیتے تھے

محمد انور کی موت بے بسی کی موت ہے اس کی لاش بھی پر اسرار حالات میں دفن کر دی گئی۔ ہمارا مطالبہ ہے کہ اس تمام سانحے کی تحقیقات کی جائے اور غریب ہاکروں کے ساتھ منصفانہ سلوک کی ضمانت دی جائے۔

کیا گلگت میں "سب اچھا ہے"؟

گلگت میں نوکر شاہی نے سیاسی کارکنوں کی جائیدادیں ضبط کر کے اپنے لامحدود اختیارات کا ایک اور ثبوت پیش کر دیا ہے، ایک خبر کے مطابق گلگت کے ریزیڈنٹ نے اپنے ایک نمائندے کو اسلام آباد بھیجا ہے کہ وہ صدر مملکت کو گلگت کی پرامن صورت حال کے بارے میں اطمینان دلا دیں حالانکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔

پچھلے دنوں احتجاجی مظاہروں کے سلسلے میں جن سیاسی کارکنوں کو مختلف الزامات کے تحت گرفتار کیا گیا تھا۔ ان پر جیلوں میں ظلم ڈھائے جا رہے ہیں۔ انہیں اخلاقی مجرموں کے ساتھ رکھ کر ذہنی اذیت دی جا رہی ہے جو لوگ پولیس کے ہاتھ نہ آ سکے انہیں مفرور اور اشتہاری ملزم قرار دے کر ان کی جائدادیں ضبط کی جا رہی ہیں۔ اب تک مالک شاہ، ناصر الدین اور محمد عیسیٰ کے علاوہ کئی اور سیاسی کارکنوں کی جائدادیں ضبط کی جا چکی ہیں۔ گلگت کی جیلوں میں

باقی صفحہ ۴۰ پر ملاحظہ فرمائیں

مکتوب حیدرآباد

۳۰ لاکھ ہاری، جینے کا حق مانگتے ہیں

زرعی انقلاب کا وعدہ کب پورا ہوگا؟

احمد الطاف

حکومت کا اختیار عوام کے نو منتخب اُمیدواروں کو کب منتقل ہوتا ہے اور آئین کے تحت جمہوری دَور کے آغاز کی نوبت کب آتی ہے، یہ سوال اپنی جگہ سنگین سہی، لیکن آب وَنمک اور روئی ڈال کے مسائل اپنی جگہ موجود ہیں۔ سوال یہ ہے کہ سندھ کی زراعت کدھر جا رہی ہے، پیداوار کی صورت کیا ہے اور لاکھوں ہاریوں کی خوشحالی کا دَور کب آئے گا۔

ہمارے ملک کی ۵۶ فیصد دولت براہِ راست اور ۲۴ فیصد بالواسطہ طور پر زراعت سے حاصل ہوتی ہے۔ پاکستان ۸۷ فیصد زرِمبادلہ بلاواسطہ اور ۹۴ فیصد بالواسطہ طور پر زرعی پیداوار کی برآمد سے کماتا ہے، اس کے باوجود جو لوگ فصلیں اُگاتے ہیں اور اپنے مُلک کے لئے دولت کے انبار لگاتے ہیں، وہ بدستور تہی دَست اور فاقہ مست ہیں۔

زمین اور زراعت

دریائے سندھ کی زیرین وادی (حیدرآباد و خیرپور ڈویژن) میں اس وقت ایک کروڑ تیس لاکھ سے زائد قابلِ کاشت اراضی ہے جس میں سے ستّر لاکھ آٹھ ہزار ایکڑ مسلسل بہنے والی نہروں سے اور پچاس لاکھ چار ہزار ایکڑ غیر مسلسل بہنے والی نہروں سے کاشت کی جاتی ہے۔ اس میں صرف اسّی لاکھ دو ہزار ایکڑ اراضی زیرِ کاشت لائی جاتی ہے۔ ۱۹۶۶ء کی ہنٹنگ رپورٹ کے مطابق سندھ کا کم و بیش سارا رقبہ شور زدہ ہے چالیس لاکھ آٹھ ہزار ایکڑ رقبہ زیادہ متاثر ہے اور اسّی لاکھ چار ہزار ایکڑ اراضی کم متاثر ہے۔ سندھ میں بیس لاکھ پانچ ہزار ایکڑ رقبہ سیلابی ہے۔ یہ علاقہ خریف کی فصل میں سیلاب زدہ ہو جاتا ہے۔ خصوصاً ضلع ٹھٹھہ کا دو فصلی مگر دلدلی زراعتی علاقہ۔ چنانچہ سیلابی علاقہ میں ربیع کی فصل میں کاشت بارآور ہوتی ہے۔ اندیشہ ہے کہ ۱۹۷۵ء میں تربیلہ بند کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد یہ علاقہ بُری طرح متاثر ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ نئی منصوبہ سازی کے مطابق اِس علاقہ کو زراعتی کے بجائے آئندہ صنعتی علاقہ بنایا جائے گا۔ اس کے علاوہ سیم وتھور کی وجہ سے مغربی پاکستان میں سالانہ ساٹھ ہزار ایکڑ اراضی اِس زمین کے ناسُور کی زَد میں آکر بیکار و بنجر ہو رہی ہے۔ ہر چھ منٹ بعد سیم وتھور ایک ایکڑ اراضی ناکارہ بنا دیتی ہے۔ اس کے سدِّباب اور متاثرہ زمینوں کو بحال اور آباد کرنے کے لئے ٹیوب ویل اور سیم نالیوں کے منصوبوں پر عملدرآمد کے منصوبے بنائے گئے لیکن مسئلہ جوں کا توں ہے۔ جنگلات بھی اُگائے جا رہے ہیں ”بعض ماہرین کی رائے میں پاکستان جیسے محدود مالی وسائل کے مُلک کے لئے اِس ضمن میں سیم نالیوں کا طریق کار سب سے زیادہ کم خرچ اور کارآمد ہے“ اس کے علاوہ شور زدہ زمین پر آسٹریلین ببول کے جنگلات اُگا کر متاثرہ زمینوں کو کفایت شعاری سے محض چند سال میں دوبارہ قابلِ کاشت بنایا جا سکتا ہے۔

ایک سرکاری رپورٹ میں بتلایا گیا ہے کہ مغربی پاکستان میں تین کروڑ ایکڑ قابلِ کاشت اراضی بیکار پڑی ہے اور دس کروڑ ایکڑ سے زائد اراضی کا ابھی سروے (SURVEY) ہونا باقی ہے۔

پیداوار

امریکی ماہرِ زراعت مسٹر جان اوبل نے ۱۱ فروری ۱۹۵۷ء کو زراعتی کالج ٹنڈو جام میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ”پاکستان کی فی ایکڑ پیداوار دُنیا میں سب سے کم ہے“۔ بدقسمتی سے ابھی تک یہی حال ہے۔

سندھ میں فی ایکڑ پیداوار بہت کم ہے جس کی ایک وجہ سیم وتھور ہے، زرعی زمینیں یکجا نہیں بلکہ بیشتر چھوٹے قطعات میں بٹی ہوئی ہیں، فرسودہ اور از کار رفتہ نظامِ زراعتی ترقی اور پیداوار میں اضافہ کی راہ میں رُکاوٹ ہے۔ کاشتکاروں کی بھاری اکثریت تعلیم سے محروم ہونے کے سبب کیمیاوی کھاد کے فوائد، بہتر بیج کی برکت اور جدید زرعی آلات کے استعمال سے ہنوز ناواقف ہے، مشینی کاشت اُس کی استطاعت سے باہر ہے۔ نتیجتاً زراعت پسماندہ ہے۔ گذشتہ دہائی میں قابلِ کاشت اراضی کے رقبہ میں اضافہ کے باوجود آبادی کے حساب سے فی کس پیداوار میں کمی کا رُجحان رہا ہے۔ اِس کی ایک وجہ خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کے باوجود آبادی میں تشویشناک اضافہ بھی ہے۔ اور لُطف یہ ہے کہ یہ اضافہ بدستور جاری ہے۔

سندھ کی خاص زراعتی پیداوار چاول، گندم، گنّا، کپاس، جوار، باجرہ، سبزی پھل اور مویشیوں کا چارہ ہے۔



سندھ میں اب تقریباً آٹھ لاکھ گانٹھیں روئی پیدا ہوتی ہے۔ روئی کی فی ایکڑ سالانہ پیداوار کا گوشوارہ یہ ہے۔

سال	فصل فی ایکڑ
۱۹۵۰ء	۱۸۲ پونڈ
۱۹۵۵ء	۱۸۸ 〃
۱۹۶۵ء	۲۲۱ 〃
۱۹۶۶ء	۲۵۷ 〃
۱۹۷۰ء	۳۳۰ 〃

کپاس کی پیداوار کے ذیل میں ۶۷-۱۹۶۶ء کے مقابلہ میں ۶۸-۱۹۶۷ء میں حیدرآباد ڈویژن میں کپاس کا زیرِ کاشت رقبہ ۲ء۲ فیصد کم تھا۔ نیز پیداوار ۱۳ء۵ فیصد کم تھی۔ اسی طرح غلّہ اور دیگر اجناس کی پیداوار میں بھی، زرعی پیداوار کے گوشوارے کمی کے مظہر ہیں۔ اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایوب شاہی کے دَور میں ہمہ گیر ترقّی کا دس سالہ جشن منانے کے باوجود، آمرانہ حکومت کا دعوٰی کس قدر کھوکھلا تھا۔ قارئین اندازہ کر سکتے ہیں کہ میکسی پاک گندم اور جاپانی کاشت کے اِری چاول کی ’وافر‘ پیداوار کے باوجود اور پاکستان کے غلّہ میں خود کفیل ہونے کے دعوٰی کے باوجود امریکہ سے پی ایل ۔۴۸۰ کے تحت غلّہ درآمد کرنا پڑا۔

متعدد وجوہات کی بناء پر ہماری فی ایکڑ پیداوار کی اوسط آمدنی صرف ۱۸۷ روپے سالانہ ہے۔

گذشتہ مارشل لا کے دوران میں مغربی پاکستان میں زرعی اصلاحات کے مطابق حیدرآباد اور خیرپور ڈویژنوں میں نہری زمین کی گذارہ یونٹ کی کم از کم حدِ ملکیت پنجاب میں ۱۲½ ایکڑ اور سندھ میں ۱۶ ایکڑ مقرر کی گئی تھی۔ لیکن مغربی پاکستان میں ستّر فیصد خاندان ایسے ہیں جن کے پاس گذارہ یونٹ سے بھی کم اراضی ہے اور یہ برائے نام قطعات بھی ناگہانی سیلاب، خشک سالی، ٹڈی دل، نباتاتی جراثیم اور دیگر ارضی وسماوی آفات کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔

سندھ کی ۸۵ فیصد کاشت کار آبادی میں ۳۰ لاکھ تعداد ہاریوں کی ہے، ان میں سے ۳۵ فیصد ہاری، چھوٹے سے چھوٹے قطعہ اراضی اور سر چھُپانے کی جگہ سے بھی محروم ہیں۔ اِن کے حالات کی اصلاح اور موثر زرعی اصلاحات کے نفاذ کی سفارش یوں تو سبھی جمہوری پارٹیوں نے کی ہے۔ لیکن خیال ہے کہ نئی صوبائی اسمبلی میں اصل ذمّہ داری پیپلز پارٹی کے ارکان پر عائد ہوگی کہ اپنے وعدوں کو جامۂ عمل پہنائیں، جاگیرداریاں ختم کریں اور فالتو اراضی زائد سرکاری قطعات کے ساتھ، ہاریوں میں تقسیم کریں۔

ساتواں صفحہ

حسن عابدی

آج کل ارباب سیاست نکتے میں سے نکتہ نکالتے ہیں۔ پہلے اس شغل کا نام بال کی کھال اتارنا تھا۔ اب ہر طرح کی کھال کا کاروبار جماعت اسلامی نے اپنے ذمے لے رکھا ہے اور نکتے عوامی پارٹیوں کے حصے میں آتے ہیں۔ شیخ صاحب کو اپنے چھ نکات پر اصرار ہے۔ ہمارے کرم فرما مولانا کوثر نیازی کا ارشاد ہے کہ چھ نکات ہمارے پاس بھی ہیں۔ اور یہ محض بنگلہ دیش کے نہیں، بلکہ پاکستان کے چھ نکات ہے۔ ان میں تین نکتے پ کے ہیں۔ دو نکتے ت کے اور ایک نکتہ ن کا حاصل جمع آئے چھ۔ مولانا نے چھکے پہ چھکا مارا ہے۔ جیت ہار کا فیصلہ تو مستقبل کرے گا۔ اور مستقبل کچھ دور نہیں۔ چند روز کی بات ہے۔ البتہ ایک نکتے کا علم ہمیں بھی ہے کہ دو جمہوری پارٹیاں جب نکتے سے نکتہ ٹکراتی ہیں تو اس تصادم میں ایک کے بھی نکتے کی شکست جمہور کے عزائم کی شکست بن جاتی ہے جمہور یہاں تک کڑے کوس طے کر کے آئے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ پھر اپنی جدوجہد اسی نکتے سے شروع کرنی پڑے۔

خبر آئی ہے کہ ۳ مارچ کو ڈھاکہ میں چھ نکات کے خلاف ایک مظاہرے کا اہتمام کیا جائے گا۔ یہ بھی سن لیجئے کہ مظاہرہ کون لوگ کریں گے۔ یادش بخیر ان میں سب سے آگے مولانا احتشام الحق تھانوی ہوں گے۔ مظاہرین کی قیادت اُن کے سپرد ہوئی ہے۔ پیچھے قطار میں عبدالصبور خاں فضل القادر چودھری، مولوی فرید احمد، خواجہ خیرالدین اور مغربی پاکستان کے "رہنماؤں" میں نواب زادہ نصراللہ خاں، لیٰسین وٹو میاں امیرالدین، خواجہ صفدر اور سردار بہادر خاں موجود ہوں گے

چھ نکات کے سوال پر دو بڑی پارٹیوں کی آویزش نے اور تو خیر کیا کیا لیکن گورستانِ سیاست کے صدیوں پرانے مردے بہر حال زندہ ہو گئے۔ جو لوگ بے منت غیر کروٹ بھی نہیں بدل سکتے تھے، وہ اب جلوس نکالیں گے اور شاید نعرے بھی لگائیں گے۔ اور اپنے تھانوی جی جنہوں نے ساری زندگی امام ضامن کے سوا کچھ نہیں باندھا، وہ اب چھ نکات کے خلاف زور باندھیں گے۔ سادہ دل عوام سمجھتے تھے کہ اس انتخاب میں انہوں نے پرانے رجعت پرستوں کو بہت گہرا دفن کیا ہے۔ لیکن جمہوری رہنماؤں کے باہمی اختلاف نے یہ موقع مہیا کیا ہے کہ مردے بھی جلوس اندر جلوس قبروں سے نکلے چلے آ رہے ہیں۔

وزارت کچی لوکری ہے۔ صدر یحییٰ نے اپنی کابینہ ۲۲ فروری کو توڑ دی۔ جس طرح انڈا توڑتے ہیں تو زردی نکلتی ہے، ناریل توڑتے ہیں تو گری نکلتی ہے، اسی طرح کابینہ توڑتے ہیں تو اس میں سے وزیر نکلتے ہیں اور نکلتے ہیں تو ٹھہرتے نہیں صدر کا اعلان سن کر وزرائے بستر گول کیا، لوٹی کاندھے پہ ڈالی۔ چمٹا ہاتھ میں پکڑا اور اپنی اپنی راہ ہو لئے۔ ۲۲ تاریخ کے اخبارات نے وزراء کے نام بھی شائع کئے ہیں اور تصویریں بھی۔ افسوس، ان میں بشیر علی صاحب موجود نہیں۔ حالانکہ بشیر علی صاحب دوسروں سے کچھ زیادہ ہی وزیر تھے بلکہ اپنی وزارت کے زمانے میں انہوں نے یہ محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ کوئی دوسرا بھی وزیر ہے۔ کتنے اہتمام سے نوابزادہ صاحب نے اپنا نام عوام کے حافظے میں محفوظ کیا تھا۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے پنجگانہ اعلان ہوتا تھا اور جماعت اسلامی کے اخبارات نے تو ان کی خبروں اور خطبوں کو باادب باملاحظہ ہوشیار کا سا رنگ دے رکھا تھا۔ لیکن عوام کا حافظہ اتنا کمزور ہوتا ہے کہ وزارت سے ان کی علیحدگی کے دوسرے دن کسی کو موصوف کا نام بھی یاد نہیں رہا۔ اخبار بینوں کو بعض کالم نویسوں سے ضرور شکایت ہوئی کہ ان کی تحریروں میں اب پہلی سی شوخی اور شگفتگی نہیں رہی۔ البتہ کالم نویسوں کا عذر یہ تھا کہ اب پہلے سے کم خون جگر پینا پڑتا ہے۔

۲۲ فروری کے اخبارات نے دوسرے وزیروں کی تصویریں اہتمام سے چھاپی ہیں اور نوابزادہ بشیر علی کو فراموش کر دیا ہے۔ ایک جماعت اسلامی کا ترجمان جسارت ہے۔ جس نے کسی تقریب کے حوالے سے نوابزادہ صاحب کی تقریر بانصویر بشیر کی کھال کے مانند، اپنے صفحات پہ سجائی ہے نوابزادہ صاحب نے اس تقریر میں صاف فرمایا ہے کہ حکومت کے سارے نظام چونکہ ناکام ہو چکے ہیں۔ لہٰذا "اسلامی" نظام کو بروئے کار آنے کا موقع ملنا چاہیے۔ کچھ اسی مضمون کی تکرار مولوی طفیل محمد کے بیان میں ہے۔ یہ دونوں جس طرح کا "اسلامی" نظام چاہتے ہیں، اس کی صراحت ضروری نہیں۔ البتہ بشیر علی صاحب سے یہ ضرور پوچھا جا سکتا تھا کہ آپ پونے دو برس تک مارشل کی حکومت میں شامل رہے۔ کیا وہ اسلامی حکومت تھی؟ اگر تھی تو آپ اس سے الگ کیوں ہوئے اور نہ تھی تو اس میں شامل کیوں ہوئے؟ دراصل نوابزادہ صاحب کے ڈھب کی اسلامی حکومت آج کل یا تو ملائشیا میں قائم ہے یا انڈونیشیا میں بلکہ نوابزادہ صاحب کے سکوت سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اب تک دونوں میں سے کسی ایک حکومت کے ارباب بست و کشاد میں شامل ہو چکے ہوں گے۔ ہمیں کیا خبر تھی کہ موصوف ابھی تک لاہور میں ہی قناعت کا دامن تھامے بیٹھے ہیں۔

باقی رہے طفیل محمد صاحب تو جس قوم نے انتخابات میں ان کی ضمانت ضبط کرا دی ہے، سب سے پہلے تو اس قوم سے زر ضمانت کی واپسی کا مطالبہ کرنا چاہیئے۔ روپے واپس آ جائیں پھر بات آگے چلے۔ ایسی قدر ناشناس قوم جو "علما" کے زر ضمانت کا تقدس بھی پیش نظر نہیں رکھتی، ان کے ارشادات کو اور ان کے "نظام اسلامی" کی دعوت کو بھلا کتنی اہمیت دے گی۔

یہ لوگ عہدوں کے لئے کھونٹے کا کام دیتے ہیں

شیخ عبدالرحمٰن صاحب کے بارے میں خبر ملی ہے کہ نیشنل پریس ٹرسٹ کی چیئرمینی سے الگ ہو گئے ہیں۔ ایک صاحب سے ذکر آیا تو کہنے لگے کہ بالکل غلط، یہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ تو اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنے والی بات ہے۔ شیخ صاحب، ماشاء اللہ، ستر بہتر سے دانا بینا آدمی، ایسی ناسمجھی کی باتیں کیوں کرنے لگے، ہاں کوئی اور انہیں الگ کر دے تو دوسری بات ہے۔ وہ خود الگ نہیں ہوں گے۔

ہم نے عرض کیا بات تو ایک ہی ہے، وہ آپ الگ ہوں یا پریس ٹرسٹ کے سیٹھ ساہوکار اس کام میں دو پیسے کا فائدہ دیکھ کر اُن کے آگے ہاتھ جوڑ دیں۔ وہ صاحب بولے اب ایسا بھی نہیں کہ شیخ صاحب کسی کے ہاتھ جوڑنے سے پگھل جائیں اور ہزاروں روپے کی ماہانہ آمدنی پہ لات مار دیں۔ انہیں تو باقاعدہ برطرف کیا گیا ہے کسی ادائے

سے آپ الگ ہو جانا، ہمارے یہاں کی روایت نہیں ہے۔ روایت یہ ہے کہ جب کسی عہدے کو ہاتھ لگانے کا موقع ملے تو تھوڑی سی گوند ساتھ رکھو۔ اسے تن بدن پر لگاؤ بلکہ گوند کا ڈبّہ سر کے اوپر اُلٹ کر عہدے کے ساتھ چپک جاؤ۔

بہت سے لوگوں کے بارے میں آپ نے سنا ہوگا کہ جب کسی عہدے سے الگ ہوئے تو وہ عہدہ ان کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ یہ وہی لوگ ہیں جو عہدے کے ساتھ چپک کر رہ جاتے ہیں اور جب رخصت ہوتے ہیں تو عہدہ بھی ان کی جان سے چپکا ہوا ساتھ ہی چلا جاتا ہے۔ بعد میں اربابِ معاملہ کو امیدواروں سے معذرت کرنی پڑتی ہے کہ صاحب وہ عہدہ تو فلاں صاحب کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔

نوجوانوں کو اپنے بزرگوں سے شکایت ہے کہ کرسی نہیں چھوڑتے۔ بزرگوں کا کہنا ہے کہ اپنے لئے کرسی کی گنجائش خود نکالو۔ دوسروں کی کرسیوں پر کیوں رال ٹپکاتے ہو۔ اپنی کرسی آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے۔

پھر یہ بات بھی ہے کہ؎

آنے والے یہاں جو آتے ہیں
کرسیاں اپنی ساتھ لاتے ہیں

بزرگوں نے اپنے لئے کرسیاں خود نکالی ہیں، درجہ بدرجہ ترقی کے امکانات خود پیدا کئے ہیں۔ اب جبتک بیٹھے ہیں ان کو سکون سے بیٹھا رہنے دو۔ نوجوان تو چل پھر کے بھی وقت گذار سکتے ہیں۔ بیچارے بوڑھے کیا کریں۔ کرسی میں دھنس کے بیٹھنے کی یہی عمر ہوتی ہے۔ بےچین اور تلوّن شعار نوجوان، جو دن بھر زمین کے گز بنے رہتے ہیں، اور رات کو گہری نیند سوتے ہیں۔ افسوس کہ دن میں اونگھنے کی لذّت سے آشنا نہیں۔

کرسی میں چوکڑی مار کر بیٹھے ہیں اور اونگھ رہے ہیں ایسے میں کسی نے کان میں پکار کر کہا کہ دو سال پورے ہونے والے ہیں تو انہوں نے ایک اور عرضی سرکار میں گذار دی کہ ایک بار پھر فدوی کی رسّی دو سال کے لئے دراز کی جائے۔

کچھ بزرگوار ہر شہر میں ایسے ہوتے ہیں جنہیں بغل میں ہاتھ ڈال کر کرسی سے اٹھانا پڑتا ہے کہ حضور، کرسیاں اور بھی ہیں اور عرصۂ زندگی مختصر ہے۔ ایک کرسی بزمِ ادب کی، ایک کرسی ادارۂ ثقافت کی اور ایک کرسی محفلِ سخن ورانی کی ہے۔ موسیقی اور ڈرامہ کونسل کی کرسی الگ ہے۔ درجن بھر سوسائٹیوں میں سے آپ کسی کے صدر ہیں، کسی کے سرپرست کسی کے متوّلی۔ کسی کے مجاور۔ ہر کرسی پر آپ کا حق ہے۔ اب یہاں سے اٹھئے۔ ان بزرگوں کی حیثیت دراصل متموّل گوالوں کی سی ہوتی ہے جو شیخ عبدالرحمٰن کی طرح ہر کرسی کا دودھ دوہتے ہیں۔ ان کے گھر میں دودھ کی نہریں بہتی ہیں۔

شرفاء کے یہاں کوٹھی کے برآمدے میں ایک اسٹینڈ رکھا ہوتا ہے جس میں بہت ساری کھونٹیاں بنی ہوتی ہیں مہمان، ڈرائنگ روم میں داخل ہونے سے پہلے اپنا ہیٹ، اوورکوٹ، چھڑی غرض کہ سر کے سوا جو کچھ بھی بارِ دوش ہو، اس پر لٹکا کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں کچھ بزرگوں کی حیثیت اسی اسٹینڈ کی سی ہے۔ معزّز ادارے فالتو عہدے اُن پر ٹانگ دیا کرتے ہیں۔ کسی ادارے نے سرپرستی کی عبا، کسی نے چیئرمینی کا ہیٹ، کسی نے رکنیت کی چھڑی اس پر لٹکا دی اور مطمئن ہو گیا۔ رفتہ رفتہ یہ سٹینڈ نما بزرگ، زیادہ سے زیادہ اداروں کی سرپرستی اور عہدیداری کو عزّت اور اعتبار کی علامت سمجھنے لگتے ہیں۔ اور ان میں سے ایک بھی عہدے کو مرتے دم تک چھوڑنے کے روادار نہیں ہوتے۔ نتیجہ یہ کہ ان کی موت سے پیدا

اب گھر میں بیٹھ کر اونگھتے

ہیں، دفتر میں بیٹھ کر اونگھتے

تو اس کی تنخواہ ملتی

اور ایک آدھ

الاؤنس بھی

ہونے والا خلا کبھی پُر نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ بیک وقت ایک درجن کرسیوں پر بیٹھنے کا اہل کہاں ملتا ہے۔

مفت خوری سٹیٹس سمبل یا علوے مرتبہ کی علامت بن گئی ہے۔ زمانہ گذرا، ہمارے ایک محلہ دار کے پاس زمین کا ایک قطعہ فالتو پڑا تھا۔ گوالنیں یہاں اُپلے تھاپتی تھیں ان کے حقّے کے لئے اوپلا یہاں سے مفت مل جاتا تھا۔ پھر نوٹنکی والوں نے یہ جگہ تاڑ لی۔ وہ سال کے سال اپنا تمبو شامیانہ یہیں لگاتے تھے، ان صاحب کو ایک مفت پاس اور دو اینٹیں، سر پھوڑنے کے لئے نہیں بلکہ بیٹھنے کے لئے دستیاب ہو جایا کرتی تھیں۔ یہ گویا روز کا راتب بندھا ہوا تھا۔ اس کے بعد تو مفت پاس ان کی کمزوری بن گیا۔ یہ اسے مرتبے کی نشانی سمجھنے لگے۔ جنازے میں بھی امید رکھتے تھے کہ مفت پاس ہاتھ لگے تو یہ گھڑے میں سے اپنی اچکن نکالیں۔ زیادہ سے زیادہ عہدوں پر چھاپہ مار کر بیٹھنے کی ہوس بھی، اسی مفت خور ذہنیت سے پیدا ہوئی ہے۔

جب ایئر مارشل اصغر خاں پہلی بار ریٹائرڈ ہوئے یعنی سیاست سے نہیں بلکہ پی آئی اے سے ریٹائر ہوئے تو ایک روایت ہے کہ انہوں نے کسی محفل میں ملک امیر محمد خاں، المعروف نواب کالاباغ مرحوم سے اپنی ملاقات کا ایک واقعہ، بعض اخبار نویسوں کو سنایا۔ نواب صاحب ان دنوں مغربی پاکستان کے گورنر تھے۔ باتوں باتوں میں کسی صاحب کا تذکرہ آیا تو انہوں نے اصغر خاں سے پوچھا کہ وہ آج کل کہاں ہیں؟ انہوں نے جواب دیا، عرصہ ہوا، ریٹائر ہو گئے۔ نواب صاحب نے کہا، ٹھیک ہے، لیکن آج کل کس محکمے میں ہیں۔ انہوں نے دوبارہ وہی جواب دیا ریٹائر ہو چکے ہیں۔ اب کے نواب صاحب نے تُنک کر کہا، اجی چھوڑیے ہمارے یہاں کون ریٹائر ہوتا ہے۔ آخر کہیں تو کام سے لگے ہوں گے۔

برصغیر پاک و ہند میں ریٹائرمنٹ کی طرح دراصل انگریزی سامراج نے ڈالی تھی۔ اور یہ طریقہ انگریزوں کا تھا کہ ادھر ملازمت کے دن پورے ہوتے ادھر بوریہ بستر لپیٹ کر یہ بھی اپنے وطن کو واپس ہو لئے۔ اب آلو کی کاشت سے لے کر لغت نویسی اور وقائع نگاری تک موصوف ہزار طرح کی تخلیقی اور علمی موشگافیوں میں اُلجھے ہوئے ہیں، پنشن کی رقم ان کے گذر اوقات کے لئے کافی ہوتی۔ زیادہ کی ہوس نہ رکھتے۔ چپ چاپ کام کرتے اور دنیا سے سدھار جاتے۔ پاکستان بننے کے بعد ریٹائرمنٹ قبول کر کے قوم کی خدمت سے سبک دوش ہونا ایک "مجرمانہ" فعل قرار پایا۔ اگر ہاتھ پاؤں میں دم باقی ہے تو صاحب کیوں نہ دفتر میں بیٹھے اور ملازمت کا حق بجا لائے۔ انتظامیہ کو اپنے تجربے سے محروم رکھنا اور پنشن کے روپوں سے گھر میں بیٹھ کر عیش اڑانا، یہ تو اچھی خاصی خودغرضی ہوئی، چنانچہ انگریز عہدیداروں کی یہ خود غرضانہ روایت رفتہ رفتہ ختم ہو گئی۔ اور اب کچھ لوگ جو ریٹائر ہو کر گوشۂ عافیت میں بیٹھے ہیں یا کوئی علمی کام محدود پیمانے پر کر رہے ہیں یا نجی نوعیت کے مشاغل میں خاموشی سے اُلجھے ہوئے ہیں اور قوم سے اس کا معاوضہ بھی طلب نہیں کرتے تو ایسے نیک نفس لوگوں کے بارے میں اس کے سوا اور کیا کہا جائے گا کہ بیچارے بے وسیلہ لوگ ہیں۔ بارسوخ ہوتے تو کسی کمیشن کے چیئرمین، کسی ٹرسٹ کے سربراہ یا کسی محکمے کے مشیر ہوتے اور مزے کرتے۔ اب گھر میں بیٹھ کر اونگھتے ہیں۔ دفتر میں بیٹھ کر اونگھتے تو اس کی تنخواہ ملتی، اور ایک آدھ الاؤنس بھی۔

آئینی امور میں اکثریت کا فیصلہ کافی نہیں ہر خطّے کے عوام کی رضامندی ضروری ہے

موجودہ دور ہماری سیاسی بصیرت، حُسنِ تدبیر اور اصلاح احوال کا نہائت نازک امتحانی دور ہے۔ ہم سب کو اس عزم و ارادے سے قدم آگے بڑھانا چاہئے کہ اپنے حالات کو پاکستان کی بہترین مصلحتوں اور پاکستانی عوام کی بہترین خواہشوں کے مطابق زیادہ سے زیادہ درست اور استوار و پائیدار رکھیں گے

دستور کی تیاری اور جمہوریت کی بحالی کا کام، جلد از جلد شروع کیا جاسکتا ہے۔

مولانا غلام رسول مہر

سمجھ میں نہیں آتا کہ اس درجہ پریشان کُن صُورتحال پر دلی رنج و قلق کے اظہار کے لئے کارآمد الفاظ کہاں سے لاؤں جو گزشتہ انتخابات میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے والی دو بڑی ملکی پارٹیوں کی غلط روش کے باعث پیدا ہو گئی ہے؟ قوموں اور ملکوں کو نازک اور پیچیدہ معاملات سے وقتاً فوقتاً سابقہ پڑتا ہی رہتا ہے اور اس راستے کو آزمائشوں سے کاملاً خالی کبھی نہیں سمجھا گیا، تاہم ایسے حالات رُونما ہونے کا بظاہر خواب و خیال بھی نہ تھا، جو ہمارے سامنے ہیں اور مخلص محبان وطن کے لئے باعث صد تشویش بنے ہوئے ہیں۔

انتخابات میں اتنی پارٹیوں نے حصہ لیا تھا کہ اندیشہ تھا، ہر پارٹی کو تھوڑے تھوڑے ممبر میسّر آگئے تھے تو دستور سازی کا کام حد درجہ مشکل ہو جائے گا۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں دو پارٹیاں خاصی نشستیں لے گئیں تو اطمینان ہو گیا تھا کہ اس طرح دستور سے متعلق بنیادی کام بظاہر آسان ہو گیا ہے۔ چونکہ ان پارٹیوں کے تعمیری پروگرام کا تعلق زیادہ تر عوام کی فلاح و بہبُود سے تھا۔ اس لئے ان کے درمیان مفاہمت ہو جائے گی اور باقی پارٹیوں کو ہم فرد بنا کر متفقہ یا زیادہ سے زیادہ قابلِ عمل دستور بنا لینا سہل ہو گا لیکن دو بڑی پارٹیوں کے افراد نے اصلاح احوال کا جو طریقہ اختیار کیا ہے وُہ حقیقتاً اصلاح نہیں تخریب کا طریقہ ہے۔

بنیادی حقائق کسے معلوم نہیں؟ داخلی و خارجی احوال کی اضطراب افزائی کس کی نظروں سے مخفی ہے؟ لیکن دونوں گروہوں کے افراد ایسی باتیں شعلوں کی طرح اگلتے جا رہے ہیں جنہیں نہ پیشِ نظر معاملے کی اصلاح و درستی کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ نہ ان کے اگل دینے سے کسی پچھلی یا اگلی، مزموم

یا حقیقی شکایت کی تلافی ہو سکتی ہے۔ البتہ ان گروہوں کی ذہنیتوں کا ایسا نقشہ منظرِ عام پر آ رہا ہے جسے کسی بھی حالت میں ملک کی صحیح تعمیر یا خدمت عوام یا دستور سازی یا بحالی جمہوریت کے نقطۂ نگاہ سے سازگار نہیں سمجھا جا سکتا۔ بلکہ اعتماد کی جگہ بے اعتمادی اور اطمینان کی جگہ بے اطمینانی پھیلانے ہی میں مدد مل سکتی ہے۔ اشد ضرورت تھی کہ ہم قومی و اجتماعی قوت کے ایک ایک ذرّے کو انتہائی احتیاط سے محفوظ رکھتے تاکہ دستور کی تکمیل اور جمہوریت کی بحالی کے بعد وہ کام جلد سے جلد شروع کیا جا سکتا، جو ہمارے عوام کے درمیان اتحاد و یکجہتی کو تقویت پہنچاتا لیکن ہم نے اس قوت کو بالکل بے محل طریق پر منتشر کرنے کا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ اس پر کون اطمینان کا اظہار کر سکتا ہے اور اسے کون کسی بھی اعتبار سے قومی خدمت قرار دے سکتا ہے؟

خوشگوار اُمیدیں؟

سر دست کے افراد اور بعض موقع پرست اصحاب کی حرصِ زر اور حرصِ اقتدار کے باعث اس مُلک پر جو ضربیں لگیں، ان کے زخم خدا جانے کب تک مندمل ہوں، لیکن عوامی نمائندوں نے بروئے کار آنے سے پیشتر ہی قلب و نظر کی بوقلمونیوں کا جو مظاہرہ کیا ہے، اس کے ساتھ مستقبل کی خوشگوار اُمیدیں وابستہ کر لینے کی اس وقت تک کون سی گنجائش ہے۔ جب تک وہ تنگ و تاریک ذہنیتیں بالکل بدل نہ جائیں گی جو ملک و قوم کی فضا اور اکھاڑے کی فضا میں بنیادی فرق ملحوظ رکھنے کی صلاحیت نہ پیدا کر لیں؟

خیال تھا کہ جن بیانات سے ہمارے اخباروں کے صفحات تین چار روز سے مزیّن چلے آتے ہیں۔ ان میں سے چند فقرے نمونے کے طور پر نقل کر دیئے جائیں۔ لیکن یہ اندیشہ دامنگیر ہُوا کہ اس طرح شاید سمجھ لیا جائے کہ لکھنے والے کے پیشِ نظر کسی ایک فریق کی حمایت اور دوسرے کی مخالفت ہے۔ حالانکہ خدا شاہد ہے کہ میرے پیشِ نظر کسی کی مخالفت نہیں۔ اس لئے کہ جو کام سامنے ہے وہ کسی بھی فریق کی مخالفت کا متحمل نہیں ہو سکتا بلکہ سب کے اتحاد و یکجہتی ہی سے شروع ہو سکتا ہے اور اسی طرح پایۂ تکمیل پر پہنچ سکتا ہے۔ اس بارے میں کسی کو یقین دلانا مشکل ہے۔ کیونکہ اصل معاملہ نیت کا ہے اور نیت کے بارے میں دل چیر کر بھی دکھایا جائے تو نتیجہ کچھ نہ نکلے گا۔

یک طرفہ فیصلہ استوار نہ ہو گا

میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ جو اصحاب اکثریت پر ہر شے کا انحصار رکھ رہے ہیں، کیا وہ اس حقیقت سے ناواقف ہیں کہ موجودہ مرحلے پر دستور بنائے بغیر وہ کس طرح ایک قدم بھی آگے بڑھانے کے حقدار ہو سکتے ہیں؟ پھر کیا یہ حقیقت کسی سلیم الفطرت انسان سے مخفی ہے کہ دستور میں ہر چھوٹے سے چھوٹے خطّے کی رضامندی حد درجہ ضروری ہے؟ نیز جن اصحاب کو نمائندوں کی کثرتِ تعداد باعثِ فخر محسوس ہوتی ہے، وہ اس بُنیادی مصلحت سے کیوں کر چشم پوشی کر سکتے ہیں کہ ہمارے وطن اور ہماری قوم کی تعمیر زیادہ سے زیادہ کشادہ دلی، فراخ حوصلگی اور ہر چھوٹے بڑے گروہ کے رضامندانہ تعاون

دستور میں ہر چھوٹے سے
چھوٹے خطے کی رضامندی
حد درجہ ضروری ہے۔

وفاق کا انحصار مختلف حصوں کے عوام کی رضامندی اور خوشنودی پر ہے

ہی سے حقیقتاً "صحیح اصول پر جاری ہو سکتی ہے، کسی ایک گروہ کے ووٹوں کی کثرت کے بل پر جو کچھ کیا جائے گا، وہ ممکن ہے وقتی طور پر ضوابط جمہوریت کے مطابق قرار دے لیا جائے لیکن اس تعمیر میں اطمینان و دلچسپی کی کیفیت پیدا ہونا غیر ممکن ہے اور جو تعمیر اطمینان و دلچسپی نیز سب کے ہمہ گیر تعاون کی روح سے خالی ہوگی اسے پائیدار و استوار نہیں سمجھا جا سکتا۔ اپنی اکثریت کی داستان تفصیل سے بیان کرنے کے بعد دوسروں پر یہ ظاہر کرنا کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں، یہ محض ایک "رعایت" ہے جو ہم نے بطور خود ضروری سمجھی تو یہ بنیادی نقطۂ نگاہ سے اس جمہوریت کی نفی ہے، جس کے ہم داعی ہیں۔ ہمارے تصور اکثریت کا فیصلہ صرف ووٹوں کی بناء پر ہونا چاہیئے بلکہ تمام طبقوں اور گروہوں کو پروگرام کے حقیقی تعمیری فوائد کا یقین دلا دینے کی بناء پر ہونا چاہیئے۔ اس سلسلے میں غلطی یہ کی جا رہی ہے کہ ہم نے انگریزی حکومت کے ماتحت جمہوریت کا جو نقشہ دیکھا، وہ ہمارے نقشۂ جمہوریت سے مختلف تھا۔ ہم پاکستانی ہیں اور ہمیں تمام ضروری کاموں میں اپنے تمام نمائندوں کے زیادہ سے زیادہ اعتماد کو اصل کار بنانا چاہیئے تاکہ ہماری قوم طبقوں اور ٹکڑیوں میں بٹنے سے محفوظ رہے۔ یہاں تک کہ پاکستان کی تقویت و استحکام پر نمائندہ عوام اور ہر طبقۂ قوم کے نزدیک ہر شے پر مقدم ہو جائے۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہم نے جمہوریت کے چند ظاہرا اوصاف تو پیش نظر رکھ لئے لیکن یہ حقیقت پیش نظر نہ رکھی کہ ہم مسلمان ہیں اور مسلمانوں میں جمہوریت کا فروغ افراد و جماعت کے زیادہ سے زیادہ اتحاد و اتفاق پر موقوف ہے۔ اس سلسلے میں بنیادی حیثیت ملکی استحکام کو حاصل ہے اور اسی بنیاد پر ہمارے اسلامی و فلاحی منصوبوں کی کامیابی کا مدار ہے۔

اگر کوئی جماعت محض اپنی اکثریت کو مددگار بنائے گی تو نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ نکلے گا کہ معاملات میں زیادہ سے زیادہ بگاڑ پیدا ہو جائے اور اس بگاڑ سے خود وہ اکثریت بھی کچھ فائدہ نہ اٹھا سکے گی بلکہ اسے نقصان ہی پہنچے گا۔

فوجی طاقت کام نہیں دیتی

ایک مقام سے صدا بلند ہوئی ہے! "پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی"۔ آخر ایسی صدائیں سوچے سمجھے بغیر بلند ہوتی رہیں گی تو کیا ان کا نتیجہ یہ نہ ہوگا کہ بناہ بخدا، حالات اصلاح پذیر ہونے کے بجائے مزید بگڑ جائیں؟ اور کونسا بڑا یا چھوٹا خطہ ہے جسے فوجی قوت و طاقت کے بل پر کسی خاص ملک کے مطابق قائم و استوار رکھا جا سکتا ہے؟ مختلف خطوں اور حصوں کی رضامندی اور خوشنودی کے سوا وفاق کا مدار و محور ہو کیا سکتا ہے اور خطوں کی رضامندی ان کے اعتماد ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

کیا ہمیں اعتراف کر لینا چاہیئے کہ گزشتہ تئیس سال میں ہم لوگ سیاسیات کی ابجد سے بھی آگاہی حاصل نہ کر سکے؟ چند "بول" تھے جو ہم نے عظیم القدر اور دردمند کار فرمایان ملت کی زبان سے سنے۔ نہ ان کی حقیقت پر غور کیا، نہ ان کے سلسلے میں صحیح طریق کار سے آشنائی حاصل کی۔ جب اور جس وقت کسی کو خیال آتا ہے۔ وہ "بول" دہرا دیتا ہے اور سمجھ لیتا ہے حب وطن کا حق ادا ہو گیا اور پاکستان بنانے کے سلسلے میں جو مقاصد تھے، ان کے تحفظ کا انتظام ہو گیا۔ اِنا للہ و اِنا الیہ راجعون۔ کتنا رنج ہوتا ہے کہ ہم لوگ بعض بدیہی معاملات کو بھی صحیح طریق پر ذہن نشین کر لینے کی صلاحیت کھو بیٹھے ہیں۔

تمام ارکان اختلافی امور کو قومی اسمبلی میں طے کریں

پھر اصلاح احوال کی یہ کونسی صورت ہے کہ قومی اسمبلی میں شرکت سے انکار کر دیا جائے۔ دوسرے فریق سے روش میں تبدیلی کا اعلان کرایا جائے؟ صحیح طریق عمل یہی ہے کہ تمام لوگ قومی اسمبلی میں شریک ہوں۔ عزم کے ساتھ اختلافی معاملات کو طے کریں۔ جلد سے جلد دستور بنائیں تاکہ اصل کام شروع ہو سکے۔ ایسے طریقے اختیار نہ کریں جن کی حیثیت بظاہر صرف جماعتی پروپیگنڈے کی سی معلوم ہو۔ پھر کیا ظاہر نہیں کہ جو طریقہ ملک کو موہوم یا حقیقی خطرات سے بچانے کے لئے اختیار کیا گیا ہے وہ تقسیم کا خطرہ قریب تر لے آیا ہے؟

آج گزشتہ تئیس برس کے معاملات پر بحث چھیڑنا اور مختلف کاموں کے مالہ و ماعلیہ کا جائزہ لینا بالکل بے معنی ہے۔ لیکن فرض کیجئے کہ بعض اصحاب کو یقین ہے۔ ان کے صوبے کے ساتھ متواتر ناواجب برتاؤ ہوتا رہا اب وہ چاہتے ہیں کہ آئندہ کے لئے ایسی کسی بے انصافی کے ارتکاب کی گنجائش نہ رہے تو اسکے انتظام میں کسی کو تامل کیوں ہو؟ کیا ایسی بے انصافیوں کا انسداد سب کے لئے اطمینان بخش نہ ہوگا۔ اسکے لئے ایسا طریق کار اختیار کیا جا سکتا ہے جو بنیادی امور کو معرض اختلال میں ڈالے بغیر سب کے خطرات اور اندیشے زائل کر دے، ہر اختلافی مسئلہ کا تصفیہ باہم گفت و شنید اور بحث و نظر سے ممکن ہے پھر پارٹیوں میں ہنگامہ آرائی پر قوت صرف کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جس سے حالات خدانخواستہ بگڑ سکتے ہیں سنور نہیں سکتے۔

سیاست دانی کے وظائف کا تقاضا یہی ہے کہ دل و دماغ ٹھنڈے رہیں، ان میں اشتعال پیدا نہ ہو، صورت حال کتنی ہی بگڑی ہوئی ہو، لیکن کامیاب سیاستدان سلجھاؤ کی تدبیریں پے در پے اختیار کرتے جاتے ہیں۔ موجودہ دور ہماری سیاسی بصیرت، حسن تدبیر اور اصلاح احوال کا نہایت نازک امتحانی دور ہے، ہم سب کو اس عزم و ارادہ سے قدم آگے بڑھانا چاہیئے کہ اپنے حالات کو پاکستان کی بہترین مصلحتوں اور پاکستانی عوام کی بہترین خواہشوں کے مطابق زیادہ سے زیادہ درست اور استوار و پائیدار رکھیں گے تاکہ عوامی بہبود کے لئے اس پروگرام کا آغاز ہو سکے جس کا آغاز ۱۹۴۸ء میں ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن کیا کیا جائے کہ کیسے کیسے لوگوں نے کن کن حیلوں اور بہانوں سے اس پروگرام کو زیادہ سے زیادہ پیچھے پھینکا پھر ایسا دور شروع ہو گیا جس میں ذاتی اغراض کے ہنگامے نے ملک کا نقشہ ہی کچھ سے کچھ بنا دیا۔ گزشتہ غلطیوں اور کوتاہیوں کو اس لئے یاد رکھنا ضروری ہے کہ پھر ایسی کوتاہی نہ ہونے پائے لیکن ان پر اس انداز میں صف ماتم بچھا کر بیٹھ جانے سے کیا حاصل ہوگا جس سے آئندہ تعمیری پروگرام بھی خلل میں پڑ جائے اور کچھ ہو ہی نہ سکے۔

محفل محفل

سحر انصاری

محفل محفل، اس نئے کالم کا عنوان ہے، جس کے تحت، جوان سال شاعر اور ادیب جناب سحر انصاری قارئین لیل و نہار کے لئے ادبی اور تہذیبی محفلوں کی روداد اور اسی نوع کے موضوعات پر تبصرے رقم کرتے رہیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ قارئین اس نئے سلسلۂ مضامین کو پسند کریں گے اور اس بارے میں اپنی رائے سے ہمیں بے تکلف مطلع فرمائیں گے۔ (ادارہ)

عطائی ادیب، جن کا "تعمیری کام" نعرہ بازی ہے

ادب کے مسائل سرسری اور سطحی بحث کے شکار ہو گئے

آج کل ادب کا مسئلہ کئی اعتبار سے اہم ہو گیا ہے۔ ادبی بحثیں، ادبی اختلافات، ادیبوں کی چشمکیں اور ادیبوں کی گروہ بندیاں کوئی نئی چیز نہیں۔ یہ کسی نہ کسی شکل میں ہمیشہ سے معاشرے میں موجود رہی ہیں۔ لیکن گزشتہ دس برس سے ادب کو جو تماشا بنا کر رکھ دیا گیا ہے اس کے بعض اہم پہلوؤں پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ اس سے پہلے ادب کی بحثیں اگر بالمشافہ ہوتی تھیں تو محفلوں اور کافی ہاؤسوں میں۔ تحریری مباحثے عموماً ادبی رسائل کے اوراق پر نظر آتے تھے۔ لیکن گزشتہ دس برس میں ادب کے نام پر صرف ایک خاص قسم کے ادیبوں کو ابھرنے کا جو موقع دیا گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں ادب کے سارے مسائل ہنگامی اور سرسری بحثوں کا شکار ہو گئے ہیں اور یہ ساری بحثیں روزناموں کے کالموں میں کسی نہ کسی عنوان جاری رہی ہیں روزناموں میں ادبی بحثوں کا سلسلہ کوئی بری بات نہیں لیکن جس طرح کسی عنوان کے تحت مجبوراً کچھ نہ کچھ لکھنے کے لئے کوئی نہ کوئی بات پیدا کرنی پڑتی ہے اسی طرح آج ادب کے نام پر بعض ملازم پیشہ ادیبوں نے حقائق کو مسخ کر کے پیش کرنے اور روزی کمانے کا طریقہ وضع کر لیا ہے۔

گزشتہ دس برس کے دوران میں ہماری درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے والوں پر بڑا ظلم ہوا ہے۔ انہیں نصابی کتابوں میں آمرانہ نظام کی توصیف ذِلطیف سے بہرہ ور کیا گیا۔ انہیں یہ تعلیم دی گئی کہ اقدار، زندگی کے آدرش اور مقصدیت سب بیکار نعرے ہیں۔ "نعرہ بازی" سے ہٹ کر تعمیری کام کرنا چاہیئے اور تعمیری کام یہ ہے کہ ہر ہنگامی اور عبوری دور سے فائدہ اٹھا کر جلد از جلد دولت، عزت، شہرت کما لی جائے۔ چنانچہ اس رجحان کی تلقین و ترویج کرنے والے بزرگوں نے عمل کر کے دکھایا اور نئے ذہنوں میں سے بعض نے ان کی تقلید کی۔ جب معاشرے کا مستقبل کام ایک شخص یا ایک گروہ کی صوابدید کا دست نگر بن جاتا ہے۔ یا پروپیگنڈے کے ذریعہ بنا دیا جاتا ہے تو عوام خصوصاً متوسط طبقے عدم تحفظ اور بے چینی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور پاؤں کے نیچے سے نکلتی ہوئی زمین کا تصور کر کے ہر قیمت پر اپنے پاؤں جمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ نوجوانوں کو جب بے یقینی اور عدم تحفظ کا شکار بنانے کی مہم چلائی گئی تو اکثر ذہنوں پر اس کا اثر بھی ہوا۔ نشر و اشاعت کے ذرائع سے ان کی براہِ راست وابستگی نے راتوں رات انہیں مشاہیر کی صف میں لا کھڑا کیا۔ پھر کیا تھا۔ اکثریت نے یہ سمجھ لیا کہ جائز حقوق کے لئے جنگ کرنا، انقلابی نظریوں پر یقین رکھنا خطرات سے خالی نہیں لہٰذا اسی نظام حیات کو زیادہ سے زیادہ تقویت دی جائے جو کھوکھلا سہی لیکن کھوکھلے پن کو چھپانے کے بہت سے کرشمے اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہیں۔

اس پوری سازش کے آلۂ کار بننے میں وہ زنگ خوردہ ذہن پیش پیش رہے جو مقصدیت اور اعلیٰ اقدار کی راہ میں تھوڑی دور چل کر تھک گئے تھے یا ذیلی راستوں اور پگڈنڈیوں پر بھاگ لئے تھے۔ روزنامہ اخبارات میں پہلے تو مقصدیت اور آدرشوں کا مذاق اڑایا گیا لیکن جب بات محدود حلقوں تک قائم رہی تو اسے وسیع تر کرنے کے لئے ترقی پسند تحریک کو غلط نقطہ نظر سے پیش کر کے سارے ادبی ماحول کو خوف و دہشت میں مبتلا کیا گیا۔ کہیں مولانا روم سے لے کر موجودہ دور کے بعض روشن خیال ادیبوں اور شاعروں کو کافر، مرتد اور گردن زدنی ٹھہرایا گیا اور کہیں نو دارد انِ ادب کو گزشتگان کا حشر دکھا کر آدرش کی راہ میں قدم رکھنے سے روکا گیا۔

یہ صورتِ حال شاید ذہنی انحطاط کی بدترین صورتوں پر منتج ہوتی لیکن معاشرے اور زندگی کی رفتار چند زنگ خوردہ ذہنوں، مفاد پرست وجودوں اور متوسط اور تحت متوسط طبقے کے چند فرسودہ ہاتھوں کی پابند نہیں ہوتی، مزدوروں، کسانوں، طالب علموں اور باشعور ادیبوں کی طاقت جب مجتمع ہوئی تو ساری زندگی میں جنبش ہوئی اور جمود حرکت سے بدل گیا۔ الیکشن کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ جو لوگ جدوجہد اور عمل کا مطالعہ کرنے کے بجائے صرف نتائج پر اپنے رد و قبول کے معیار مرتب کرتے ہیں، اب وہ بھی سمجھ گئے ہیں کہ حقیقت کا اصل روپ کیا ہے۔ بعض رسائل اور اخبارات میں لکھنے والے بعض ترقی پسند ادیبوں کے حوالے سے یہ بات لکھتے ہیں کہ ترقی پسند تنظیم ختم ہو چکی ہے شاید ایک حد تک یہ درست ہو کیونکہ ترقی پسند تنظیم اپنے محدود وجود کی حیثیت سے ختم ہو کر آج پورے ملک پر تحریک کی صورت میں محیط ہو چکی ہے اور اس کے اراکین صرف چند ادیب ہی نہیں بلکہ عوام کی بہت بڑی اکثریت اس میں شامل ہے۔ ایک زمانے میں ترقی پسند تحریک کا جو منشور تھا آج ملک کی تمام اہم سیاسی جماعتوں کے منشوروں نے اسے اپنا لیا ہے۔ جب ملک کی سیاست اس نہج پر چل رہی ہو تو بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس نقطۂ نظر میں توانائی ہے اور کس میں ضعف۔

گزشتہ دس برس کے عجوبوں میں سے ایک "اسلام پسندی" ہے۔ یعنی مسلمانوں کے علاوہ بھی اس ملک میں ایک طبقہ پیدا ہوا جو خود کو مسلمان کے بجائے "اسلام پسند" کہلانا پسند کرتا ہے۔ ان نام نہاد اسلام پسندوں نے اپنے اپنے مطلب کی باتیں اسلام سے اخذ کر لی ہیں چنانچہ بعض صحافی نما ادیبوں اور ادیب نما صحافیوں نے یہ سمجھ لیا کہ جس طرح اسلام میں تین دن کے فاقے کے بعد کتا بھی حلال ہو جاتا ہے اسی طرح اپنے ادب کے افلاس اور فاقہ زدگی کو دور کرنے کے لئے اخباری سطروں میں نوٹس کی طرح کرتب دکھا کر روزی کمانے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اب ان کرتبوں میں ایک کرتب بھی شامل ہو گیا ہے کہ ترقی پسندوں کو ان کے مخالفین یہ بتائیں کہ اصل ترقی پسندی کیا ہے۔ گویا چیل کوّے مچھلیوں پر پھبتی کس رہے ہیں کہ انہیں تیرنا نہیں آتا ہے۔ اور زاغ و زغن بلبل کو آدابِ نغمہ سکھانے کے لئے چوپچ کھولنے کا اہتمام کر رہے ہیں۔

ایک طرف تو روزی کمانے کا یہ طریقہ ترقی پسندوں کے مخالفین نے وضع کر لیا ہے دوسری طرف جب اپنے بارے میں ترقی پسندوں سے کوئی رائے لکھوانا چاہتے ہیں تو یہ "ادیب" اور محرر نہ صرف یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم بھی ترقی پسند تحریک سے متاثر رہے ہیں بلکہ اپنی قدیم وفاداریوں کا ثبوت دینے کیلئے

قسم کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہم تو راتوں کو شہر کی دیواروں پر ترقی پسند تحریک کے پوسٹر بھی چسپاں کرتے تھے۔ اس قسم کے ادیب و شاعر ترقی پسندوں سے اپنے بارے میں لکھوانا یوں ضروری سمجھتے ہیں کہ ایک تو وہ یہ جانتے ہیں کہ اہمیت اور قدر و قیمت انہی ادیبوں اور نقادوں کی ہے دوسرے جب کبھی ادب کی محفل میں ان کے لئے حاشیوں پر بیٹھنے کی بھی گنجائش نہیں رہے گی تو وہ اس قسم کی تحریریں دکھا کر ادب کی محفل میں باریاب ہونے کی کوشش کریں گے۔ سند کے طور پر ترقی پسند نقادوں کی تحریریں اپنے حق میں پیش کرنے کے واقعے تو گذشتہ دنوں رونما ہو ہی چکے ہیں۔

ادب کے نزاعی مسئلوں کو مزید نزاعی بنانے کے لئے ترقی پسندوں کے مخالفین مشرق و مغرب کا سوال بھی اٹھاتے ہیں، حالانکہ بیچارے نہ مشرق سے واقف ہیں نہ مغرب سے۔ روزانہ اخبارات کی خبریں بھی دلجمعی سے پڑھ لیتے ہوں تو بڑی بات ہے۔ لیکن دعویٰ یہ ہے کہ مارکسزم سیکھنے کے لئے انکی تحریروں سے فیض یاب ہونا ضروری ہے۔ مغرب کے جن حضرات نے ترقی پسندی کی مخالفت کی ہے، ان کی تحریروں میں شخصیت کا وقار اور علم کی متانت یوں موجود ہوتی ہے کہ ان کے استدلال کو پڑھ کر صورت حال کا تجزیہ کرنے اور اطراف و اکناف کا جائزہ لینے میں کوئی تامل نہیں ہوتا۔ لیکن مشرق کا محض نام رٹنے والوں کا یہ عالم ہے کہ مارکسزم کی ابجد تو بڑی چیز ہے اس کی بعض موٹی موٹی اصطلاحوں کے وہ معنی بھی انہیں نہیں معلوم جو پولیٹیکل سائنس یا پولیٹیکل اکانومی کی ڈکشنریوں میں مل جاتے ہیں۔ یہ لوگ مارکسزم کے بعض شارحین کی کتابوں سے تو کیا ان کے ناموں کے ہجوں تک سے ناواقف ہیں اور دعویٰ یہ ہے کہ ترقی پسند ادیب ان کے کالم پڑھ کر بصیرت حاصل کریں۔ بڑے بڑے طبیبوں، ڈاکٹروں اور سرجنوں کے مقابلے میں فٹ پاتھ پر بیٹھ کر "گھریلو دوائیں" بیچنے والے عطائی بھی اپنے گرد مجمع لگا کر یہی کہتے ہیں کہ انگریزی مشینوں اور طبی اوزار سے کام لینے والے بڑے بڑے ڈاکٹر کچھ نہیں جانتے البتہ ان کے ہاتھ میں سفوف دنداں اور اکسیر معدہ کی جو شیشیاں ہیں وہ یورپ، امریکہ، چین، جاپان، پاکستان اور ہندوستان غرض ہر جگہ کے ڈاکٹروں کی خدمات کو نیچا دکھانے اور تشخیص کو نادم کرنے کے لئے کافی ہیں۔

یہ عطائی ادیب نجی محفلوں میں واسطے دیتے ہیں کہ بھائی پیٹ کا مسئلہ ہے اگر اخباری کالموں میں ترقی پسندوں کو گالیاں نہ دیں تو گھر کی گاڑی کیسے چلے؟ بھائی فرق اتنا ہی ہے کہ ترقی پسند سب کے لئے اسی انداز سے سوچتے ہیں کہ عوام کی اس بے پناہ اکثریت کے گھروں کی گاڑیاں کیسے چلیں گی وہ وظیفہ خواری کے عوض شاہ کو دعائیں دینے کے قائل نہیں ہیں۔

طلباء کے گیارہ نکات

مشرقی پاکستان کے نوجوان کیا چاہتے ہیں؟

موجودہ سیاسی صورت حال میں مشرقی پاکستان کے طلبا کے گیارہ نکات ایک بار پھر بڑی اہمیت اختیار کر گئے ہیں۔ مشرقی پاکستان عوامی لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے اور آل پاکستان عوامی لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے طلبا کے گیارہ نکات کو قبول کر لیا ہے۔ جب کہ پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے بھی اپنے مشرقی پاکستان کے حالیہ دورے میں طلبا کے گیارہ نکات میں سے دس نکات منظور کرنے کا اعلان کیا ہے۔ اس طرح پاکستان کی دو اکثریتی پارٹیوں نے مشرقی پاکستان کے طلبا کے گیارہ اور دس نکات قبول کر کے اس کی اہمیت کو تسلیم کر لیا ہے۔

پورے پاکستان کی پوری سیاست کا محور شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ اور طلبا کے گیارہ نکات کے گرد گھوم رہا ہے۔ عوامی لیگ اور شیخ مجیب الرحمان اقتدار میں آنے کے بعد ان نکات کو عملی جامہ پہنانے کی یقین دہانی کرا چکے ہیں۔ یہاں تک کہ ۱۹۶۸ء میں ایوب آمریت کے خلاف جب طلبا بھرپور جدوجہد کر رہے تھے تو نیشنل عوامی پارٹی (بھاشانی گروپ) نے بھی گیارہ نکات کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں قبول کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جہاں تک چھ نکات کا تعلق ہے وہ اپنے مضمون اور متن کے اعتبار سے خالص سیاسی مطالبہ ہے جس میں مرکز اور صوبوں کے اختیارات اور علاقائی خود مختاری پر زور دیا گیا ہے۔ مگر اس کے برعکس طلبا کے گیارہ نکات عوام کے معاشی، سیاسی ثقافتی اور تعلیمی مطالبات پر مشتمل ہیں۔

مشرقی پاکستان طلبا کی مجلس عمل کے گیارہ نکات حسب ذیل ہیں۔

(۱) (الف) صوبائی حیثیت کے کالجوں کی سابقہ حیثیت برقرار کی جائے۔
(ب) اسکولوں اور کالجوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔
(پ) کالجوں میں نائٹ شفٹ کا انتظام کیا جائے۔
(ت) فیس کی شرح میں ۵۰ فی صد کمی کی جائے۔
(ٹ) ہوسٹل فیس میں ۵۰ فی صد کمی کی جائے۔
(ج) بنگالی کو ذریعہ تعلیم اور دفتری زبان بنایا جائے۔
(چ) اساتذہ کی تنخواہوں میں اضافہ کیا جائے۔
(خ) آٹھویں کلاس تک مفت تعلیم دی جائے
(غ) ایک میڈیکل یونیورسٹی کا قیام اور میڈیکل کونسل آرڈیننس کی تنسیخ
(د) پولی ٹکنک کے طلبا کو مراعات دی جائیں۔
(ذ) طلبا کو ریلوں اور بسوں کے سفر میں مراعات دی جائیں۔
(ر) ملازمتوں کے مواقع مہیا کئے جائیں۔
(ز) یونیورسٹی آرڈیننس کی تنسیخ اور یونیورسٹی کو خود مختار ادارہ بنایا جائے۔
۳ نیشنل ایجوکیشن کمیشن اور حمود الرحمن کمیشن کو ختم کیا جائے۔
(۲) بالغ رائے دہی کی بنیاد پر پارلیمانی جمہوریت بحال کی جائے۔
۳- (الف) وفاقی نظام حکومت اور آزاد مقننہ کی ضمانت دی جائے۔
(ب) فیڈرل حکومت کے اختیارات دفاع، خارجہ پالیسی اور کرنسی تک محدود رکھے جائیں۔
(۴) بلوچستان سرحد اور سندھ میں علاقائی خود مختاری کے ساتھ سب فیڈریشن کا قیام بنکوں، انشورنش کمپنیوں اور بڑی صنعتوں کو قومی تحویل میں لیا جائے۔
(۶) کسانوں پر عائد شدہ محصولات اور ٹیکسوں میں کمی کی جائے۔
(۷) محنت کشوں کو معقول اجرت اور بونس دیا جائے
(۸) مشرقی پاکستان میں سیلاب کی روک تھام کی جائے
(۹) تمام ہنگامی قوانین، سیکورٹی ایکٹ اور امتناعی احکامات واپس لئے جائیں۔
(۱۰) سیٹو سنٹو اور امریکہ سے دوسرے فوجی معاہدے ختم کئے جائیں۔
(۱۱) تمام نظربندوں اور سیاسی قیدیوں کو فوری طور پر رہا کیا جائے۔

ڈھاکہ سے ایک خط :۔ احمد الیاس

پاکستان کی تاریخ کا سب سے بڑا سوالیہ نشان ۳ مارچ ؟

چھاترو لیگ کے نوجوان صدر نور عالم صدیقی نے اپنی جذباتی تقریر میں شیخ مجیب الرحمان کو متنبہ کیا کہ اگر انہوں نے شہیدوں کے خون سے بے ایمانی کرتے ہوئے چھ نکات کے ایک نقطے سے بھی انحراف کیا تو انہیں بنگلہ دیش کی سرزمین پر سیاست کرنے نہیں دیا جائے گا۔

پاکستان، سیاسی اور معاشی طور پر آج جس نازک موڑ پر پہنچ گیا ہے، گذشتہ ۲۳ سال کے دوران کبھی اس کا تصور بھی نہیں کیا گیا تھا۔ صدر یحییٰ کے اس اعلان کے بعد کہ ۳ مارچ سے ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کا اجلاس شروع ہو جائے گا۔ عام لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا تھا کہ اب جمہوریت کا کارواں اپنی منزل مقصود کے قریب پہنچ گیا ہے اور اقتدار عوامی نمائندوں کو منتقل ہونے میں کچھ زیادہ دن نہیں رہے۔ لیکن انتخاب کے بعد سے ہمارے ملک کی سیاست میانہ روی سے انتہا پسندی کی طرف جس طرح مائل ہو رہی ہے اسکی وجہ سے اب قطعی طور پر کوئی بات کہنی مشکل ہے۔ ملک کی اکثریتی پارٹی کے قائد شیخ مجیب الرحمٰن کی جانب سے دستور سازی کے لئے چھ نکات پر مسلسل اصرار اور مغربی پاکستان کی اکثریتی پارٹی پیپلز پارٹی کے چیئرمین جناب ذوالفقار علی بھٹو کی طرف سے اسمبلی کے اجلاس کے بائیکاٹ کی دھمکی نے آج صحیح معنوں میں ملک کو سیاسی تذبذب میں مبتلا کر دیا ہے۔

مشرقی بازو میں چھ نکات پر جس شد و مد سے اصرار کیا جا رہا ہے اس کے نتیجے میں بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک غیر یقینی مستقبل سے دوچار ہونے والے ہیں لیکن صورتحال یہ ہے کہ گفت و شنید اور افہام و تفہیم کے دروازے ابھی تک کھلے ہوئے ہیں۔ شیخ مجیب اور جناب بھٹو کے ساتھ ملک کے دیگر سیاسی رہنماؤں کی ملاقات کا سلسلہ جاری ہے۔ گذشتہ ایک ہفتے کے دوران مغربی پاکستان کے ایک درجن سے زائد سیاسی رہنماؤں نے عوامی لیگی سربراہ سے ملاقات کی ہے اور ملک کو درپیش سیاسی و آئینی مسائل پر ان سے تبادلۂ خیالات کیا ہے۔ ان ملاقات کرنے والوں میں سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کے علاوہ سابق فوجی افسران صدر یحییٰ کی برطرف شدہ کابینہ کے وزیر اور غیر ملکی سفارتی نمائندے بھی شامل تھے۔ اسی طرح مغربی پاکستان میں بھی چیئرمین بھٹو کے ساتھ مغربی پاکستان کے دیگر سیاسی رہنماؤں کی ملاقات ہوتی رہی ہے۔

مشرقی پاکستان میں بیٹھ کر سر دست یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ جناب بھٹو نے جناب ولی خاں، جناب قیوم خاں، ایئر مارشل نور خاں، جناب ممتاز دولتانہ اور مفتی محمود کے علاوہ صدر یحییٰ سے کیا باتیں کیں، لیکن شیخ مجیب الرحمٰن اور مغربی پاکستان کے مختلف سیاسی رہنماؤں کے درمیان جو مذاکرات ہوئے ان کے بارے میں یہاں کے سیاسی رہنماؤں کے درمیان جو مذاکرات ہوئے ان کے بارے میں یہاں کے سیاسی مبصرین کلی طور پر باخبر ہیں۔ ان سیاسی مبصرین کے خیال میں مغربی پاکستان سے جو بھی سیاسی لیڈران شیخ صاحب سے ملاقات کرنے آئے وہ اس حد تک تو ضرور کامیاب رہے کہ انہوں نے شیخ صاحب کو آئین سازی میں اپنی طرف سے مکمل تعاون کا یقین دلایا لیکن ان رہنماؤں کی بات چیت سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ ان کو مغربی پاکستان کی رائے عامہ کی حمایت حاصل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سیاسی رہنما خواہ وہ پنجاب کے شوکت حیات ہوں یا کراچی کے مولانا شاہ احمد نورانی خواہ وہ بلوچستان کے نواب اکبر بگٹی ہوں یا سندھ کے جی ایم سید ڈھاکہ پریس کے سامنے دوٹوک الفاظ میں اس بات کی وضاحت نہیں کر سکے۔ "پیپلز پارٹی کی غیر موجودگی میں بننے والا چھ نکات پر مبنی دستور مغربی پاکستان کے عوام کے لئے کس حد تک قابل قبول ہوگا۔ یہ صورتِ حال کا ایک پہلو ہے۔"

> "دونوں میں سے کسی ایک فریق کا تنہا اقدام، قوم کی مشترکہ خواہش کے خلاف ہوگا"
> پور بو دیش کے مبصر کا تبصرہ آئندہ صفحے پر ملاحظہ کیجئے۔

دوسری جانب ڈھاکہ اور مشرقی پاکستان کا وہ شدید ردعمل ہے جو پیپلز پارٹی کے حالیہ بیانات کے نتیجے میں ظاہر ہوا ہے۔ بلاشبہ پیپلز پارٹی کے خلاف شدید اور سخت الفاظ پر مشتمل تنقید اور نکتہ چینی کے ساتھ ساتھ کہیں ہلکے اور نرم الفاظ میں بھی تبصرے کئے گئے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ مشرقی پاکستان آج مکمل طور پر اس بات کے حق میں ہے کہ اقتدار کی پُرامن منتقلی کے لئے ۳ مارچ کو اسمبلی کا اجلاس منعقد ہونا ضروری ہے۔

میانہ رو اور اعتدال پسند افراد کے نزدیک دستور ساز اسمبلی ہی وہ واحد فورم ہے جس کے ذریعے تمام متنازعہ آئینی اور دیگر مسائل حل کئے جا سکتے ہیں۔ اور قومی اسمبلی میں وہ واحد سیاسی پلیٹ فارم ہے جس کے ذریعہ ایک اقلیتی پارٹی کے لئے رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اسمبلی اگر ایک فرد کی بلائی ہوئی ہوتی تو اس کا بائیکاٹ کرنا عین جمہوری عمل ہوتا لیکن قوم کی منتخب کردہ اسمبلی سے علیحدگی اختیار کرنا نہ صرف یہ کہ ایک غیر جمہوری طرز عمل کے مترادف ہے بلکہ موجودہ نازک صورت حال میں دانشمندی اور حب الوطنی کے تقاضے کے بھی خلاف ہے۔ اس اعتدال پسندانہ تجزیے کے برعکس مشرقی پاکستان میں خود عوامی لیگ کا انتہا پسند حلقہ اب مفاہمت اور یکجہتی کی باتوں کو مغربی پاکستان کے استحصالی طبقے کا ایک حربہ قرار دے رہا ہے۔ یہ انتہا پسند گروپ کھل کر یہ مطالبہ کر رہا ہے کہ "بنگال کو آزاد کراؤ" اور "مفاہمت کو خیر باد کہو"۔ اس گروپ کے نزدیک پیپلز پارٹی کی طرف سے چھ نکات کی مخالفت دراصل مغربی پاکستان کی مخالفت ہے۔ اور اس تاثر نے آج ان انتہا پسند عناصر کو مغربی پاکستان کے خلاف ایک مورچہ بنانے کا موقع فراہم کر دیا ہے۔

عوامی لیگ پر انتہا پسندوں کا دباؤ

۲۱ فروری کو لسانی تحریک کے شہداء کو خراج عقیدت پیش کرنے کے سلسلے میں عوامی لیگ کی طرف سے پروگرام مرتب کئے گئے تو اس پروگرام کے تحت چھ نکات کے انتہا پسند حامیوں نے اپنی طاقت کا بھرپور مظاہرہ کیا اور عوامی لیگ کی مرکزی قیادت پر دباؤ ڈالا کہ وہ کسی قیمت پر بھی اپنے مؤقف میں تبدیلی نہ کرے یہ اسی دباؤ کا نتیجہ تھا کہ ۲۱ فروری کی نصف شب کو شہیدوں کے مزار سے نکلنے والے مشعل بردار جلوس کی قیادت خود شیخ مجیب الرحمٰن کو کرنا پڑی اور انہیں شہید مینار پر ایک جوشیلی تقریر کے ذریعے اس انتہا پسند گروپ کو یہ تاثر دینا پڑا کہ وہ ہر قیمت پر چھ نکات کا احترام کریں گے خواہ اس میں انہیں اپنی جان ہی کیوں نہ قربان کرنی پڑے۔ اسی دن پلٹن میدان میں عوامی لیگ کی حامی طلباء تنظیم کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے ایک جلسہ عام میں چھاترو لیگ کے نوجوان صدر نور عالم صدیقی نے اپنی جذباتی تقریر میں شیخ مجیب الرحمٰن کو انتباہ کیا کہ اگر انہوں نے شہیدوں کے خون سے بے ایمانی کرتے ہوئے چھ نکات کے ایک نقطے سے بھی انحراف کیا تو انہیں بنگلہ دیش کی سرزمین پر سیاست کرنے نہیں دیا جائے گا۔

اس صورتِ حال کے پیش نظر مشرقی پاکستان کے سیاسی مبصرین اس خدشے کا اظہار کر رہے ہیں کہ اگر صدر یحییٰ کے اعلان کے مطابق ۳ مارچ کو ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کا اجلاس شروع نہیں ہو سکا تو پھر کوئی نہیں بتا سکتا کہ ۴ مارچ کو ملک کی صورتِ حال کیا ہوگی؟ کیونکہ ۳ مارچ کی تاریخ اب پاکستان کی سیاسی تاریخ میں ایک فیصلہ کن حیثیت اختیار کر چکی ہے۔

بنگلہ روزنامہ پوربو دیش کے کالم نگار کا تبصرہ

جنابِ بھٹو اور قومی اسمبلی

از :- عبدالغفار چودھری

پاکستان پیپلز پارٹی کے چیرمین جناب ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے رفقائے کار کے ساتھ آئندہ ۳ مارچ کو منعقد ہونے والے قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت سے معذوری ظاہر کی ہے جس کا سارے پاکستان پر انتہائی شدید ردِ عمل ہوا ہے اور جناب بھٹو کے فیصلے سے پاکستان کی سالمیت اور قومی یکجہتی کی خواہش رکھنے والوں کو بڑی حیرت ہوئی ہے چنانچہ مشرقی پاکستان سے نورالامین اور مغربی پاکستان سے نواب زادہ نصراللہ خاں جیسے معمر سیاست دانوں نے بھی بھٹو صاحب کے فیصلے پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ انتخاب میں عوامی لیگ کے چھ نکات کی جس سیاسی جماعت ـــ جماعتِ اسلامی نے سب سے زیادہ مخالفت کی تھی اس کے لیڈر مولانا مودودی بھی جناب بھٹو کے فیصلے سے متفق نہیں ہو سکے ہیں تاہم جناب بھٹو کی پارٹی پاکستان پیپلز پارٹی مغربی پاکستان کی سب سے بڑی اور عوام کی نمائندہ پارٹی ہے اس لئے اس نے جب ڈھاکہ میں منعقدہ قومی اسمبلی کے اجلاس کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا ہے تو اس کے پاکستان کی سیاسیات پر جو دُور رس اثرات مرتسم ہوں گے، اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔

جناب بھٹو کی سیاسی زندگی کا آغاز خواہ جس طرح بھی ہو وہ گذشتہ تین چار سال سے پاکستان کی جمہوری سیاسیات سے گہرے طور پر منسلک ہیں اور انہوں نے متعدد بار جمہوری سیاسیات پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا ہے لہٰذا ان سے فطری طور پر اُمید کی جاتی ہے کہ وہ کوئی ایسا ناقابلِ تبدیل اور بے لوچ فیصلہ نہیں کریں گے جس سے پاکستان میں جمہوری عمل کے ارتقا میں رکاوٹ پیدا ہو اور ملک میں جمہوریت کا مستقبل غیر یقینی ہو جائے۔ جمہوریت میں پارلیمنٹ کا مقصد تبادلۂ خیالات کے علاوہ تصوّرات اور نظریات کا تعیّن بھی ہے۔ جمہوریت میں اکثریت کی رائے اور فیصلے کی اہمیت ہونے کے باوجود اقلیت کی رائے کو نظر انداز نہیں کیا جاتا ہے۔ پارلیمنٹ یا قومی اسمبلی واحد جگہ ہے جہاں کوئی بھی رُکن پارلیمنٹ کے اپنے مخصوص طریقۂ عمل کے مطابق (خواہ اس کا تعلق اکثریتی جماعت سے ہو یا اقلیتی جماعت سے یا وہ آزاد ہو) بلا کسی خوف و اندیشے کے اپنی رائے کا اظہار کر سکتا ہے۔ اُس کے خلاف برسرِ اقتدار حکومت بھی پارلیمنٹ کے اندر کوئی اقدام نہیں کر سکتی۔ پارلیمنٹ کے ممبران صرف اراکینِ قومی اسمبلی سے مخاطب ہو کر تقریر نہیں کرتے بلکہ وہ اِس فورم کے ذریعہ پوری قوم سے خطاب کرتے ہیں۔ اِن تمام باتوں کا مقصد وہاں صرف عوام کی صدا پہنچانا نہیں بلکہ رائے عامّہ ہموار کرنا بھی ہے اس طرح پارلیمنٹ میں جو آج اقلیت میں ہیں، وہ کل عوامی حمایت و تائید سے اکثریت میں بدل جاتے ہیں اور اپنے تصوّرات و نظریات کے مطابق حکومت چلاتے ہیں چنانچہ انتقالِ اختیارات رائے عامّہ کی تشکیل اور ریاستی اقتدار پر کنٹرول کا حقیقی ذریعہ پارلیمنٹ ہوتی ہے۔ اگر اس حقیقی ذریعہ کو نظر انداز کر دیا گیا تو پُرامن طور پر انتقالِ اختیارات۔ رائے عامّہ کے احترام اور تبادلۂ خیالات کی کوئی جمہوری راہ کھُلی نہیں رہتی۔

ایوّب خاں کے دَور میں جب بعض لیڈروں نے گول میز کانفرنس کا بائیکاٹ کیا تھا اس وقت بھی بعض حلقوں کی جانب سے انتباہ کیا گیا تھا کہ خون خرابے سے بچنے اور غیر یقینی صورتِ حال سے احتراز کرنے کے لیے پُرامن مذاکرات کو ترک نہیں کرنا چاہیئے۔ گول میز کانفرنس کے بائیکاٹ کے خلاف جن لوگوں نے آواز بلند کی تھی آگے چل کر اُن کی پیشن گوئی درُست ثابت ہوئی تھی تاہم گول میز کانفرنس ایک فرد کی بُلائی ہوئی تھی لیکن موجودہ قومی اسمبلی قوم کے منتخب نمائندوں کا اجلاس ہے ایسی صورت میں قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت اور مُلک کے لئے ایک دستور کی ترتیب ان دونوں باتوں کی بڑی اہمیت ہے۔ اِن دونوں اہم معاملات کے سلسلے میں جذباتیت یا علاقائیت سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیئے اور تمام حلقوں کو موجودہ سنگین صورتِ حال کی نزاکت سمجھنی چاہیئے۔

سبھی کی رضامندی سے دستور بنانا مناسب ہے

ہم نے پہلے بھی کہا ہے کہ دستور مختلف زبانیں بولنے والوں اور مختلف علاقوں میں رہنے والوں کا ایک ساتھ مِل جُل کر زندگی بسر کرنے کا اجتماعی معاہدہ ہوتا ہے چنانچہ اکثریت کے ووٹ سے دستور منظور کرنے کا عام طریقہ رائج ہونے کے باوجود سبھی کی رضامندی اور مصالحت کی بُنیاد پر دستور مرتّب کرنا مناسب ہے۔ اس سلسلے میں قومی اسمبلی کا کردار بہت اہم ہوتا ہے۔ مُلک میں کس حد تک قابلِ عمل اور مستحکم بُنیاد پر دستور بنے گا، اس کا انحصار قومی اسمبلی کے اراکین کی قائدانہ صلاحیت اور تدبّر پر ہوتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ دستور سازی میں اکثریتی پارٹی کا کردار بہت اہم ہوتا ہے لیکن اقلیتی پارٹی صرف اس ایوان میں ہی اپنے خیالات و نظریات پیش کر سکتی ہے اور اس طرح اپنی موافقت میں ممبران کی رائے ہموار کر سکتی ہے۔ درحقیقت یہی جمہوری طریقۂ کار ہے اور اس طریقۂ کار کو ترک کر کے صرف دستور ہی کیوں، کوئی بھی مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ جناب بھٹو کو شاید اندیشہ ہے کہ انکی پارٹی چونکہ اسمبلی میں اقلیت میں ہے، اس لئے صرف اکثریت کی بنیاد پر ہی نہیں، علاقائیت کی بُنیاد پر بھی دستور منظور کر لیا جائے گا اور اس طرح چونکہ آبادی کی بنیاد پر مشرقی پاکستان کو زیادہ نمائندگی حاصل ہے اس لئے مشرقی پاکستان کی اکثریتی پارٹی دستور سازی کے سلسلے میں غلبہ حاصل کر لے گی۔ اکثریت کی حاکمیت جمہوریت کی بُنیادی شرط ہے اس لیئے اس سلسلے میں کسی قسم کی شکوہ و شکایت کی گنجائش نہیں ہے، لیکن پاکستان کی گذشتہ ۲۳ سال کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سیاسی اور اقتصادی عدم مساوات کی وجہ سے مشرقی پاکستان کو جو نقصان پہنچا ہے حالیہ اِنتخاب میں اس کا ہی اظہار ہوا ہے اس لئے گذشتہ ۲۳ سال کی سیاسیات کے نتیجہ میں یہ تصوّر کرنا غلط ہے کہ اب مشرقی پاکستان مغربی پاکستان پر اپنا فیصلہ یا رائے مسلّط کرنے کا کوئی ارادہ رکھتا ہے۔ اس طرح مغربی پاکستان کے بارے میں بھی یہ سمجھنا غلط ہے کہ مغربی پاکستان کے لیڈر مستقبل میں بھی علاقائی نابرابری برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے لیڈروں کے درمیان برابری کی بُنیاد پر دستور پیش کرنے کے سوال پر اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے لیکن ان باتوں کا تمام تر انحصار سیاسی تدبّر اور قیادت پر ہے۔

کنفرنٹیشن کی پالیسی صحیح نہیں

گذشتہ ۲۳ برسوں میں سیاسی تدبّر اور قائدانہ صلاحیت کے فقدان کی وجہ سے پاکستان کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا ہے۔ دو دو بار دستور یہ ناکام ہوئی ہے اور قوم کے اتّحاد اور ملک کے وجود کو زبردست چیلنج کا سامنا کرنا پڑا ہے اِس وقت ضرورت ملک کے دونوں حِصّوں کے درمیان "کنفرنٹیشن" کی پالیسی نہیں بلکہ ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ تعاون و اشتراک ہے اگر علاقائیت پرستی اور ذاتی وقار کا سوال اُٹھایا گیا تو اس سے مُلک کو تباہی و بربادی کی جانب لے جانا ہوگا۔ اس قسم کے اندیشہ ناک صورتِ حال سے پاکستان کے صرف انتہا پسند اور جارحیت پسند سیاسی حلقوں کو فائدہ پہنچے گا اور بین الاقوامی اعصابی جنگ اور آویزش سے مُلک میں خون خرابہ اور جنگ و جدل کا بازار گرم ہو جائے گا۔

مُلک کے دونوں حِصّوں میں ایسے مفاد پرست اور خودغرض عناصر موجود ہیں جنہیں پاکستان کی سالمیت پر کوئی یقین نہیں ہے۔ پاکستان کی سب سے بڑی کمزوری جغرافیائی حالت ہے چنانچہ اس جغرافیائی بُعد کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیئے جس سے مُلک کے دونوں حِصّوں کے درمیان جغرافیائی دوری کے ساتھ ذہنی دوری بھی پیدا ہو۔ ملک اور قوم کو شیخ مجیب الرحمٰن اور ذوالفقار علی بھٹو پر صرف اعتبار ہی نہیں ہے بلکہ ان پر انتہائی اہم ذمّہ داری بھی دی گئی ہے اس اہم ذمّہ داری کو پورا کرنا صرف ایک فریق کا نہیں دونوں فریقین کا فرض ہے ان دونوں میں سے جو بھی تنہا کوئی اقدام کرنا چاہے گا وہ قوم کی مشترکہ خواہش کے خلاف اقدام کرے گا۔

شبیر مجتبیٰ قادری بی۔اے

بہار آشوب

پہلی آواز

چمن میں اب کے قیامت کی فصلِ گل آئی ہوا کے دوش پہ بادِ صبا کی میت ہے
کلی کلی کی زباں پر ہے زخمِ خارِ جفا شگفتِ شاخِ بہاراں شجر پہ تہمت ہے
روش روش ہے عنادل کے خوں کی ارزانی قفس قفس خمِ زنجیر کی حکایت ہے
وہ راہرو ہو کہ صیاد ہو کہ ہو گل چیں چمن میں ہر کوئی آمادۂ اذیت ہے

دوسری آواز

فسانۂ غمِ تازہ ہے ہر نفس دل کو بہانۂ ستمِ نو لبِ شکایت ہے
قدم قدم وہی دار و رسن کے ہنگامے نظر نظر وہی سامانِ صد جراحت ہے
ہے آنکھ آئینۂ عبرتِ فسنا آموز جگر مرقعِ رنگِ حنائے حسرت ہے

تیسری آواز

یہ سب بجا ہے مگر خانہ زادگانِ چمن بہار کا یہ نیا روپ جاوداں تو نہیں
نہیں ہے دستِ ستم پر اجارہ گلچیں کا کمندِ کوتہِ صیاد بیکراں تو نہیں
نگوں ہیں مژدۂ عشرت کا بھی ترانہ ہے چمن میں اپنا مقدر فقط فغاں تو نہیں

سب مل کر

جہاں میں گردشِ ایام کو قرار نہیں اسی یقین سے دل و جاں ہیں اک طراوت ہے
ہر ایک ٹوٹی ہوئی شاخ پھر سے پھوٹے گی ہر ایک پھول نئے زخم کی علامت ہے

شبِ سیاہِ تشدد کا خاتمہ ہوگا
ورودِ صبحِ اماں لابدی حقیقت ہے

باسط عظیم

غزل

سچے تھے قول سب ہی ہمارے کہے ہوئے
جو کچھ لکھے تھے ہم نے وہی فیصلے ہوئے
چہرے ہیں گردِ راہِ سفر سے اٹے ہوئے
دامن ہیں چاک چاک گریباں پھٹے ہوئے
اے منزلِ مراد بتا تو کہاں ہے اب
یاں تک تو آ گئے ہیں تجھے ڈھونڈتے ہوئے
ہر اک قدم پہ روح نے پائی اذیتیں!!
ہر لمحہ اپنے ساتھ نئے سانحے ہوئے
ہم آرزوئے زیست ہیں اے مرگِ زندگی
ہیں مدتوں سے تیرے مقابل ڈٹے ہوئے
تو تھا تو راستوں کی صعوبت نہ تھی مجھے
تجھ سے بچھڑ کے اور کٹھن راستے ہوئے
شاید یہاں سے گزرے تھے وحشت کے قافلے
پھر آج راستوں میں ہیں پتھر پڑے ہوئے
زندہ تھیں کل بھی ہم سے جنوں کی حکایتیں
اور آج بھی ہیں ہم سے یہ مقتل سجے ہوئے
وہ نفرتوں کا ابر تھا کھل کر برس گیا!!!
اب دیکھ آسماں پہ ہیں بادل چھٹے ہوئے
اک سمت سو رہے ہیں مکانوں کے سلسلے
اک سمت کچھ محل ہیں مگر جاگتے ہوئے
رہ رہ کے یاد آتے ہیں اب تک وہ بام و در
گو مدتیں ہوئیں ہمیں گھر سے چلے ہوئے
باسط عظیم مرزا رسا کے طفیل سے
اربابِ فکر و فن میں ترے تذکرے ہوئے

امریکہ کی انقلابی خاتون سے ملاقات

کیا ایک اور سامراجی سازش کامیاب ہوجائے گی؟

کیا ایک بار اور مقتل سجے گا؟

امریکہ کی نیگرو انقلابی خاتون انجیلا ڈیوس پر سازش، قتل اور اغوار کے الزامات عائد کئے گئے ہیں۔ امریکی سامراج نے انہیں پابہ زنجیر کردیا گیا ہے، جیل کے اندر انجیلا ڈیوس پر غیر معمولی پابندیاں عائد کردی گئی ہیں، اس کے متعلق باہر کی دنیا کو بہت کم خبریں ملتی ہیں۔ امریکی حکام اور سامراجی پریس دنیا بھر کے عوام کو یہ باور کرانے میں مصروف ہیں کہ ڈیوس کا واقعہ معمولی نوعیت کا ہے۔ اور ایک ایسے ملک میں جہاں ہر ۳۶ منٹ کے بعد ایک قتل، ایک انسانی جان کی لرزہ خیز ہلاکت معمول بن چکی ہے، اس کی حیثیت ایک عام مجرم سے زیادہ نہیں ہے۔

سامراجی پریس اپنی رپورٹوں میں انجیلا ڈیوس کو انسانی مجرم کی صورت میں پیش کرکے اس واقعہ کے سیاسی پہلو پر پردہ ڈالنے کی گھناؤنی سازش میں مصروف ہیں۔ نیگرو مصنف جیمس بادون کا کہنا ہے کہ امریکی حکام انقلابی خاتون انجیلا ڈیوس کے گرد سرد مہری اور خاموشی کا جال بن کر اسکے گواہوں کو توڑ کر اور جیل کے اندر اسے ہر طرح سے دبا کر اس کا حوصلہ پست کرنا چاہتے ہیں۔"

انجیلا ڈیوس کا کہنا ہے کہ امریکی سامراج تشدد اور دباؤ کے تمام حربے آزمالے، وہ مجھے ہر حال میں ثابت قدم پائے گا۔ میں کمیونسٹ اصولوں کی خاطر اپنی جان تک دینے کے لئے تیار ہوں، سامراج کا مکروفریب زیادہ عرصہ تک کامیاب نہ ہوگا۔ اس کا پردہ چاک ہوگا۔ اور امریکی عوام جان لیں گے کہ حق پر کون ہے۔"

انجیلا ڈیوس ان دنوں نیویارک میں عورتوں کی جیل میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہی ہے۔ اس بات کا امکان ہے کہ طے شدہ منصوبے کے تحت اُسے اگلے ہفتے تک کیلیفورنیا کی حکومت کے حوالے کردیا جائے جہاں ڈیوس کو اغوار قتل اور سازش کے الزامات میں پھانسی یا عمر قید کی سزا دی جاسکتی ہے۔ اگر ایسا ہوا تو سامراج کے ملک میں سینکڑوں انقلابیوں کی طرح ایک اور انقلابی سامراج کی سازش کی بھینٹ چڑھ جائے گی، ایک انوکھی ڈرامے کا ڈراپ سین ہوگا۔ ایک بار اور مقتل سجے گا، اور اسکے در و بام، خون کے چھینٹوں سے رنگین ہوجائیں گے۔

گارجین کے نمائندے مائیکل ایبرس نے جیل میں انجیلا ڈیوس سے ملاقات کی اور اس سے انٹرویو کیا۔ انجیلا نے انٹرویو میں جو کچھ کہا اس سے اس کی ہوشمندی، جرأت اور غیر معمولی سیاسی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے، سامراجی ہتھکنڈے اور قید و بند کی سختیاں اُسے اپنے موقف سے ایک انچ بھی نہ ہٹا سکیں۔ سوال اور اُن کے جواب ملاحظہ کیجئے۔

سوال:۔ کیا آپ کو انصاف کے حصول میں کامیابی کی امید ہے؟

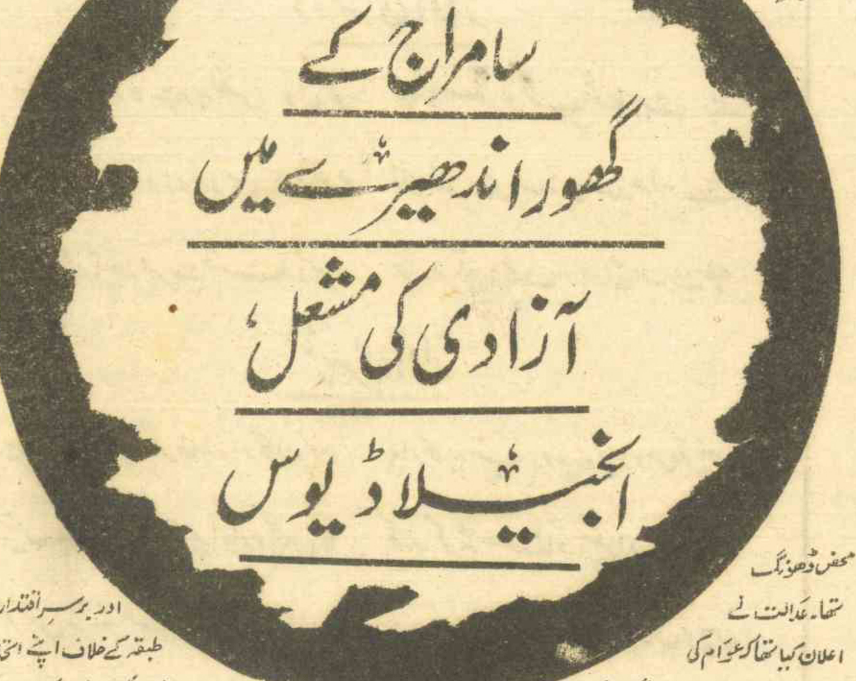
جواب:۔ صاف صاف بتادوں! میں اس بارے میں زیادہ بے قرار نہیں ہوں۔ میری درخواست کو کسی معقول وجہ کے بغیر سماعت کے لئے نامنظور کردیا گیا۔ جبکہ میرے اٹارنی نے عدالت کے روبرو پرزور دلائل پیش کئے تھے۔ عدالت نے تو محض یہ ناٹک رچایا تھا کہ انصاف مانگنے والے کو انصاف دیا جارہا ہے۔ مگر انصاف دینے کا یہ سارا معاملہ محض ڈھونگ تھا۔ عدالت نے اعلان کیا تھا کہ عوام کی نگاہیں اس عدالت کی جانب لگی ہوئی ہیں۔ وہ کیلیفورنیا کے ایک جج کی موت کے سلسلے میں انصاف کے طلبگار ہیں۔ لیکن عدالت کے اس اعلان کے پیچھے برسر اقتدار گروہ کا یہ مطالبہ چھپا ہوا ہے کہ اسے تمام انقلابیوں کا خون اور گوشت پوست درکار ہے۔ لہذا آخری لمحے میں حکم امتناعی کا اجرار حقائق کی پردہ پوشی کی ایک کمزور اور بے معنی سی کوشش تھی، امریکی حکام، عدالت، راک فیلر اور کیلیفورنیا کے گورنر رونالڈ نے پہلے ہی سے مجھے میرے قاتلوں کے ہاتھوں میں سونپنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔

جہاں تک مقدمے کی غیر جانبدارانہ کارروائی کا تعلق ہے، اسکے بارے میں میری ایک رائے ہے، اس ملک کا عدالتی نظام برسر اقتدار گروہ کے ہاتھوں میں استحصال کرنے کا ایک طاقتور ہتھیار ہے۔ اور یہ ہتھیار روزافزوں موثر بنتا جارہا ہے۔ اس ہتھیار سے پسے ہوئے عوام اور باشعور انقلابیوں کی جدوجہد کو کچلنے کے علاوہ سیاہ فام انقلابیوں کے جذبۂ حریت کو دبانے کا بھی کام لیا جارہا ہے، کوئی بھی شخص اپنی نجی حیثیت میں ایک دن کسی عدالت میں گذار کر موجودہ حالات سے واقف ہوسکتا ہے۔ اب تو نام نہاد جمہوریت کے ظاہری خدوخال بھی زوال پذیر ہوچکے ہیں۔ چنانچہ موجودہ عدالتی طریق کار سے جو استحصال کا ایک حصہ ہے۔ انصاف کی توقع کرنا فضول ہے۔ مجھے اس بات پر یقین ہے کہ میں اپنے تحفظ کے سلسلے میں جو بھی قانونی کارروائی کروں گی اس کا انجام میرے حق میں نہ ہوگا۔ پسے ہوئے عوام کو چاہیے کہ وہ آزادی اور انصاف کے حصول کی خاطر مربوط اختیار کریا

اور برسر اقتدار طبقہ کے خلاف اپنے اتحاد کا مظاہرہ انتہائی منظم طور پر کریں۔

سوال:۔ آپ کو دنیا بھر کے ملکوں سے ہمدردی، اور تعاون کے خطوط موصول ہورہے ہیں۔ کیا آپ اس تعاون کی نوعیت کے بارے میں کچھ بتاسکتی ہیں۔

جواب: مجھے بیشتار ملکوں کے عوام اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلارہے ہیں۔ سوشلسٹ ملکوں نے کسی نہ کسی صورت میں احتجاج بھی کیا ہے۔ یوگوسلاویہ(?) یعنی کیوبا، جرمنی، اٹلی اور فرانس میں میری حمایت میں جو مظاہرے اور احتجاج ہوئے ہیں۔ اس سے مجھے بیحد خوشی ہوئی ہے۔ مظاہرے منظم طریقے سے کئے گئے ہیں۔ پوسٹروں، پمفلٹوں سے احتجاج کی ابتدا کی گئی اور فنڈ کھول





انقلابی رہنما انجیلا ڈیوس کی ایک قلمی تصویر

دیئے گئے ہیں۔ مجھے ہر روز ۱سو سے لے کر چار سو خطوط ملتے ہیں ان میں نصف سے زیادہ لاطینی امریکہ، ایشیا اور افریقہ کے ہوتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں اسٹاک ہوم میں عالمی امن کونسل کا اجلاس ہوا ہے جس میں فیصلہ کیا گیا ہے کہ میرے تحفظ کے لئے بین الاقوامی مہم شروع کی جائے گی۔ میرے سلسلے میں دنیا بھر کے ملکوں میں جو کچھ کیا جا رہا ہے اس سے میں پوری طرح مطمئن ہوں، مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ اس مہم کو اس ملک کے تمام سیاسی قیدیوں کی رہائی کے لئے ایک باقاعدہ جنگ کی صورت میں تبدیل کر دینا چاہیئے۔

سوال:۔ آپ نے ایک انقلابی کی حیثیت سے فرانس، مغربی جرمنی اور کیوبا میں بھی کچھ دن گزارے ہیں۔ ان ملکوں سے آپ نے کیا انقلابی تجربہ حاصل کیا۔

جواب:۔ کوئی بھی شخص اس وقت ایک سچا انقلابی نہیں بن سکتا جب تک وہ سامراج کے خلاف لڑنے والے دنیا بھر کے انقلابیوں سے اپنے آپ کو منسلک نہیں کر لیتا۔ میرا غیر ملکی دورہ یونیورسٹی تعلیم کے لئے تھا۔ لیکن اس سے میری سیاسی سوچ اور عقیدے میں پختگی پیدا ہوئی۔ ۱۹۶۲ء میں فرانس کے قیام کے دوران میں مجھے الجزائری عوام کی جدوجہد کا تجربہ ہوا۔ اور اس تجربے سے یہ واضح تصور حاصل ہوا ہے کہ ہمارے ملک میں ہماری اپنی جدوجہد کا رُخ کیا ہونا چاہیئے۔ یہ تصور بھی مجھے فرانسیسیوں کے ذریعہ ملا کہ جہاں آزادی اور انصاف کے حصول میں رکاوٹ پیدا ہو گی، وہاں عوام اس کے خلاف جدوجہد کریں گے۔ فرانس میں میرا رابطہ الجزائری انقلابیوں کے ساتھ رہا، جو آزادی اور انصاف کے حصول کے لئے فرانس جیسی طاقتور حکومت سے نبرد آزما تھے۔ اور پولیس کے تشدد کا نشانہ بنتے تھے۔ جرمنی میں مجھے فلسفے کے مطالعے کا موقع ملا۔ وہاں طلبا کی تحریکوں اور ان کی جدوجہد میں شامل ہونے اور قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ مارکس کی تعلیمات نے ان کی جدوجہد کو صحیح راستے پر ڈال دیا تھا۔ وہ آئے دن ویت نام میں امریکی سامراج اور مغربی جرمنی کی کٹھ پتلی حکومت کے خلاف زبردست مظاہرے کرتے تھے میں سوشلسٹ اسٹوڈنٹس لیگ کے تحت ہونے والے مظاہروں میں شرکت کرتی تھی۔ ان مظاہروں میں شرکت کرنے کے سے یہ خیال پیدا ہوا کہ مجھے بھی اپنے ملک کے سیاہ فام ہم وطنوں کے حقوق کے لئے جدوجہد کرنی چاہیئے۔

ڈیوس کا سفر کیوبا

کیوبا کے دورہ سے میں نے بہت کچھ حاصل کیا۔ یہ کسی بھی سوشلسٹ ملک میں میرا پہلا دورہ تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں سے ایک جیتے جاگتے سوشلسٹ ملک کو دیکھنے کا موقع ملا۔ ملک کے محنت کشوں، طلبا، اور کمیونسٹ پارٹی کے رہنماؤں سے ملنے کے بعد مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ انقلابی مقصد کے لئے غیر معمولی جرارت، قربانی اور تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیوبا کو دیکھنے کے بعد یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ انقلابی جدوجہد سے زیادہ مشکل کام انقلابی جدوجہد کے ذریعہ اقتدار حاصل کرنا ہے اور اس سے زیادہ مشکل کام ایک انقلابی سوسائٹی کی تعمیر کے لئے اس اقتدار کو قائم رکھنا ہے۔ انقلاب سے قبل کیوبا میں بھی نسل پرستی کا جنون تھا، شمالی امریکہ کی پٹھو حکومت اس جنون سے پورا پورا فائدہ اٹھاتی تھی۔ مگر انقلاب کے بعد نسل پرستی کا یہ جنون سامراج اور اس کے پٹھوؤں کے ساتھ کیوبا کی زمین میں دفن کر دیا گیا۔ کیوبا میں سفید اور سیاہ فام، دونوں بھائیوں کی طرح سوشلسٹ معاشرے، ملک کی ترقی اور عوام کی خوشحالی کے لئے انتھک جدوجہد کر رہے ہیں۔ سامراج اور نسل پرستی کے خلاف افریقہ اور امریکہ کے عوام کی انقلابی طرز فکر اور جدوجہد نے میرے ارادے کو حوصلہ بخشا کہ میں بھی اپنے ملک میں واپس جا کر عوامی جدوجہد میں حصہ لوں۔

سوال:۔ آپ نے امریکہ میں رہتے ہوئے کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت کیوں اختیار کی؟

جواب:۔ کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہونے کا فیصلہ میرے اس عقیدے کا عملی اظہار ہے کہ ملک سے سرمایہ داری کے خاتمے، استحصال سے عوام کی نجات، سیاہ فام باشندوں کی آزادی اور ملک میں ایک سوشلسٹ معاشرے کے قیام میں کمیونسٹ پارٹی ہی صحیح رہنمائی کر سکتی ہے، مارکسزم اور لینن ازم کے اعلیٰ اصولوں کی روشنی میں اپنی جدوجہد کو آگے بڑھانے کے لئے میں چی لومبا کلب میں شامل ہو گئی۔ جو لاس اینجلس کے سرگرم سیاہ فام لوگوں کی مشترکہ کمیونسٹ پارٹی ہے۔ ہم روشن خیال اور سفید فام کمیونسٹوں کا بھی خیر مقدم کرتے ہیں۔ لیکن اس بات پر زور دیتے ہیں کہ سیاہ فاموں کی اس طبقاتی جدوجہد کی قیادت محنت کش طبقے سے تعلق رکھنے والے سیاہ فاموں کے ہاتھ میں رہے

سوال:۔ ایک مشترکہ مقصد کے حصول کے لئے سفید فام

فاشسٹ نظام میں سیاسی اسیروں کی رہائی کی تحریک، اس نظام کو ختم کئے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی

اور سیاہ فام عوام کے تعلقات کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے ۔ کیا دونوں کا اتحاد ممکن ہے اور اگر ہے تو یہ اتحاد کس بنیاد پر ہوگا ۔؟

جواب :۔ اس بارے میں اکثر سنا گیا ہے کہ سیاہ فام تنہا، اس ملک سے سرمایہ دارانہ نظام اکھاڑ پھینکیں گے ۔ اگر ہم نے آپ کو صحیح طور پر منظم کر لیا ۔ اور حالات بدستور رہے، تو ہم اپنے تشدد کے ذریعہ اس ملک کو جھکا دیں گے ۔ ممکن ہے یہ بات ٹھیک ہو، اس کے بارے میں میں کچھ زیادہ نہیں کہہ سکتی ۔ لیکن میں ایک بات اچھی طرح سے جانتی ہوں کہ اس ملک میں ایک کامیاب انقلاب کا مقصد ملک کی تباہی نہ ہوگا بلکہ اس نظام اور اس کے اداروں کی تباہی ہوگا جس کے ذریعہ عوام کا استحصال کیا جاتا ہے ۔ سفید اور سیاہ کے امتیازات کھڑے کئے جاتے ہیں، آقا اور غلام کے درمیان فاصلے پیدا کئے جاتے ہیں ۔ کوئی شخص اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ امریکی سرمایہ دار سیاہ فام محنت کشوں کی محنت سے اپنی دولت میں اضافہ کرتے ہیں، اس ملک کے ذرائع اور وسائل سیاہ فام محنت کشوں کی پیداوار ہیں جن پر آج مٹھی بھر سرمایہ داروں نے قبضہ کر رکھا ہے ۔ چنانچہ ہماری تاریخی جدوجہد کی اسٹراٹیجی کا بنیادی اصول پیداواری وسائل اور ذرائع کی تباہی پر نہیں ہونا چاہئے بلکہ ان ملکیتی رشتوں پر ضرب کاری ہونا چاہئے، جس کے تحت پوری دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ گئی ہے اور سیاہ فاموں کی اکثریت، معاشی طور پر انتہائی قابلِ رحم حالت کو پہنچ چکی ہے ۔

یہاں سیاہ اور سفید سب برابر ہیں

مشترکہ مقصد کے حصول میں جہاں تک سفید فام اور سیاہ فام باشندوں کے باہمی تعلق کا معاملہ ہے میرا خیال ہے کہ استحصال کی چکی میں یہ دونوں ہی بری طرح پس رہے ہیں ۔ افریقی مرد اور عورتیں جہاں صدیوں سے سرمایہ دارانہ نظام میں سیاسی معاشی اور سماجی طور پر غلام کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں وہیں سفید فام عوام بھی تقریباً اسی قسم کے حالات سے دوچار ہیں ۔ بیشتر ملکوں کے سفید فام عوام ایک دن ہماری طرح آزادی حاصل کریں گے اور سوشلسٹ معاشرے کے ذریعہ اپنے حالات بدل ڈالیں گے ۔ ہم پیداواری ذرائع کو قبضہ میں لے کر اس کے ہر حصے کو انقلابی عمل کے سانچے میں ڈھال دینا چاہتے ہیں تاکہ ہم جو اس پیداواری عمل میں مشین کے پرزے کی طرح کام کرتے ہیں اس کا پھل پا سکیں ۔ یہی ایک راستہ ہے جس پر چل کر سفید فام اور سیاہ فام دونوں طرح کے باشندے برسرِ اقتدار طبقہ سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں ۔ سفید اور سیاہ اتحاد کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سیاہ فاموں کے موجودہ مسائل کو سمجھا جائے اور ایک بھرپور جدوجہد کی قیادت کے لئے سیاہ فام باشندوں کو مواقع دیئے جائیں ۔

محنت کش عورتوں کا ایثار

سیاہ فام قیادت کی ضرورت اس وجہ سے بھی محسوس ہوتی ہے کہ امریکی معاشرے میں سیاہ فام لوگ خاص طور پر مشقِ ستم بنے ہوتے ہیں ۔ انہیں نسل منافرت کا نشانہ بنایا جاتا ہے، سیاسی حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے، معاشی طور پر وہ انتہائی پسماندہ ہیں ۔ اور سماجی زندگی میں انہیں کوئی مقام حاصل نہیں ہے ۔ اس لئے موجودہ نظام کے خلاف اُن کی اپنی جدوجہد میں قیادت بھی اُن ہی کے ہاتھ میں رہنی چاہیئے ۔

سوال ! پہلے آپ سیاسی اسیروں کی آزادی کی مہم کی ایک سرگرم کارکن تھیں ۔ اور اب آپ خود ایک سیاسی اسیر بن چکی ہیں ۔ حالات کی اس روشنی میں پوری تحریک کے اس رُخ کے بارے میں آپ کے کیا تاثرات ہیں ۔

جواب ۔ سیاسی قیدیوں کی آزادی کی تحریک مختلف حالات میں مختلف ہوتی ہے ۔ فاشسٹ نظام میں اس قسم کی تحریک کامیاب نہیں ہوتی ۔ اس کی کامیابی کا اندازہ صرف رہا ہونے والے قیدیوں کی تعداد سے نہیں لگایا جاتا ہے، بلکہ اس قسم کی تحریک کو موجودہ نظام کے خلاف استعمال کرنا چاہیئے ۔ گرفتار ہونے والے سیاہ فام عام طور پر کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں ۔ اور عوام سے ان کا گہرا رابطہ ہوتا ہے، اس طرح سیاسی اسیروں کی رہائی عوامی تحریک کا ایک حصہ بن چکی ہے

اس تحریک سے امریکی عوام یہ بات سمجھنے لگے ہیں کہ بے شمار سیاسی قیدیوں کو جھوٹے اور بے بنیاد مقدمات میں پھنسا کر قید کر دیا گیا ہے ۔ جارج جیکسن اور سولیداد برادرز اس کی مثالیں ہیں ۔ سیاہ فام کمیونسٹوں کو قتل یا اغوا یا اسی قسم کے دوسرے لرزہ خیز الزامات میں گرفتار کر کے جیل کی کال کوٹھری میں ڈال دیا جاتا ہے ۔

سوال ۔ عورتوں کی تحریک کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے ۔ کیا سیاہ فام عورتیں تحریک میں کوئی اہم کردار انجام دے سکتی ہیں ۔

جواب ۔ انقلابی تحریک میں عورتوں کا ساتھ لینا ضروری ہوتا ہے ۔ استحصالی معاشرے کا اثر جہاں مردوں پر ہوتا ہے ۔ وہیں، اس سے عورتیں بھی متاثر ہوتی ہیں ۔ بورژوا طبقے سے تعلق رکھنے والی ٹھیٹ بورژوا سوچ رکھنے والی عورتیں انقلاب دشمن ہوتی ہیں ۔ جب کہ محنت کش طبقے سے تعلق رکھنے والی روشن خیال عورتیں انقلاب کے لئے مردوں کے برابر قربانیاں دیتی ہیں ۔ اس میں سفید فام اور سیاہ فام عورتوں کی تفریق کرنا غلط ہے ۔ سیاہ فام عورتوں کو اپنی آزادی کے لئے اپنے مردوں کے ساتھ جدوجہد کرنا ہوگا ۔ اور اس جدوجہد کو اس وقت تک جاری رکھنا ہوگا جب تک مکمل آزادی حاصل نہیں ہو جاتی ۔

وفا کا صلہ

ساقی فاروقی

شکستہ حال مسیحا، شکستہ دل سقراط
برہنہ جسمِ سلیماں، برہنہ سر بلقیس
تہہِ کمند اُجالے، تہہِ کمند بہار
نہ کوئی صبح شناسا، نہ کوئی شام انیس
خدائے ارض و سماوات کی طرح خاموش
رسولِ سیف کی زد میں صلیب پر تقدیس
یہی وفا کا صلہ تھا کہ اشک بار رہے
تمام ہم پہ ستم ہائے دلبرانہ ہوئے
جسے چرا کے بہت دور لے گئیں راتیں
اُس آفتاب سے مایوس ہم دوانہ ہوئے
یہ حوصلہ بھی بہت ہے کہ اتنی رات گئے
نئے سفر پہ نئے قافلے روانہ ہوئے

انقلابی طریق جنگ کیا ہے؟

اقبال احمد

سامراجیوں کا ظلم، کامیاب انقلاب کی ضمانت بن جاتا ہے

یہ بتانا مشکل ہے کہ کوئی حکومت کس درجہ پہ پہنچ کر عوام سے اخلاقی طور پر آنا کٹ جاتی ہے کہ پھر خواہ کتنے ہی وعدے کیوں نہ کرے اور اصلاحات کیوں نہ لائے، اس کا کھویا ہوا اعتماد عوام میں بحال نہ ہوگا اور عوام کی مزاحمت کم نہ ہوگی۔ کم از کم الجزائر میں محسوس ہوتا تھا کہ نامقبولیت کا وہ دور آگیا ہے۔ کیونکہ فرانسیسیوں نے آبادی کی "از سر نو درجہ بندی" کر کے شہریوں کو اذیت دینا اور قتل کرنا شروع کر دیا تھا۔ بہت سے الجزائری رہنما خیال کرتے ہیں کہ فرانس کو جب سب سے بڑی فوجی کامیابی حاصل ہوئی، یعنی جنرل ماسو نے جب قصبہ فتح کیا تو انقلاب کی آمد گویا یقینی بن گئی (الجزیرہ کی مسلمان آبادی کے اس علاقہ کو ۱۹۵۷ - ۵۸ کی اس فوجی کارروائی میں ملبے کا ڈھیر بنا دیا گیا تھا) فرانس، جن لوگوں کو بلا تخصیص تباہ و تاراج کر رہا تھا، اگرچہ بادلِ ناخواستہ ایسا کر رہا تھا، تاہم پھر بھی، وہ ان لوگوں کی وفاداری تو خیر دور کی بات ہے، اب ان کا اعتماد بھی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

جب ظالم فوجیں جنگ کو طول دیتی ہیں

انقلاب کے مقاصد سے دانشوروں اور اعتدال پسندوں کا گریز اور فرار بسا اوقات اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ باقاعدہ معرکہ اب گرم ہوا ہی چاہتا ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ انقلابی جنگ اب ختم ہو جائے گی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ دانش ور، خاص طور پر ایشیائی قوموں کے دانشور، جمہوریت پسند اور آزاد خیال گروہوں کے لوگ ہوتے ہیں، جنہیں طاقت کا منظم استعمال سخت ناگوار ہوا کرتا ہے۔ یہ لوگ جو کسی حد تک اپنے کلچر سے لاتعلق ہو چکے ہوتے ہیں، مغرب کا اثر ان پر غالب ہوتا ہے، اور شہر کے مرکزی ماحول میں سانس لینے کے عادی ہوا کرتے ہیں، دراصل کسانوں پر بھروسہ نہیں کرتے، البتہ ان کے دل میں کسانوں کے حالات کی اصلاح کی خواہش ضرور ہوتی ہے جب کوئی مسلح انقلاب برپا ہوتا ہے تو ان کے بارے میں یہ امکان ہوتا ہے کہ اعتدال کا راستہ اختیار کریں گے۔ یعنی یہ امید کریں گے کہ سودے بازی کے حربے کے طور پر مسلح کارروائی سے ڈرا دھمکا کر کچھ اصلاحات کی یقین دہانی حاصل کر لی جائے گی، جب حکومت کی ناکامی یقینی ہو جاتی ہے اور انقلاب کی کامیابی سامنے نظر آتی ہے تو یہ لوگ یا تو جلاوطنی اختیار کر لیتے ہیں یا انقلابیوں کا ساتھ چھوڑ کر الگ ہو جاتے ہیں

وہ فوجیں جنہیں روایتی طریقِ جنگ کی تربیت ملی ہو انقلابی جنگ میں اس شیطانی منطق پر عمل کرتی ہیں کہ جگہ جگہ اپنی مرضی کے محاذ کھولنے چاہئیں۔ یہ منطق دراصل چھاپہ مار جنگ میں ان کی شدید ناکامی اور مایوسی کے ردِ عمل کے طور پر پیدا ہوتی ہے اور نہ صرف یہ کہ روایتی جنگ لڑنے والوں کا بیکار محض ہونا ثابت کر دیتی ہے، بلکہ ان کی تربیت اور تنظیم کا سرے سے کوئی جواز ہی باقی نہیں رہتا۔

اس کے علاوہ پیشہ ور سپاہیوں کو اگر یہ معلوم ہو جائے کہ لڑائی میں ان کا مقابلہ عوام کے باغیانہ جذبے کے ساتھ ہے تو وہ اپنا حوصلہ برقرار نہیں رکھ سکتے۔ یہیں سے لامحالہ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ عوام کے طرزِ عمل میں اس فوج کی دہشت کارفرما ہوتی ہے، جسے کسی غیر ملکی طاقت نے مسلح کیا ہے، جس نے اسکی تربیت کی ہے اور جو اسے برابر ہدایت دے رہی ہے۔ لہٰذا اس خواہش کو تقویت ملتی ہے کہ دشمن کو کھلی جنگ میں مقابلے پر آمادہ کیا جائے چونکہ عام آبادی کے خلاف جوابی اور انتقامی کارروائی سے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوتے، لہٰذا روایتی انداز میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے بس یہی ایک راستہ رہ جاتا ہے کہ جنگ ایک آزاد اور خود مختار حکومت کے خلاف شروع کر دی جائے۔ الجزائر میں یہی وہ مطالبہ تھا جس کی بنا پر فرانس، سویز کے حملے میں شامل ہو گیا۔ اس کے بعد تیونس کے سرحدی گاؤں سیدی یوسف پر اس نے بمباری کی اور پھر پے درپے بہت سی فوجی بغاوتیں رونما ہوئیں، یہاں تک فرانس کی جمہوریہ کا تختہ الٹا گیا۔ فرانس کی حکومت اگر اپنی فوج کے اس دباؤ کے آگے ہتھیار ڈال دیتی تو فرانس دنیا کی وہ پہلی طاقت ہوتا جو پناہ دینے کے مسئلہ بین الاقوامی اصول کی خلاف ورزی کرتا۔ یہ وہ اصول تھا، جس کا احترام کوریا، یونان، تیونس اور ملایا میں بھی کیا گیا۔

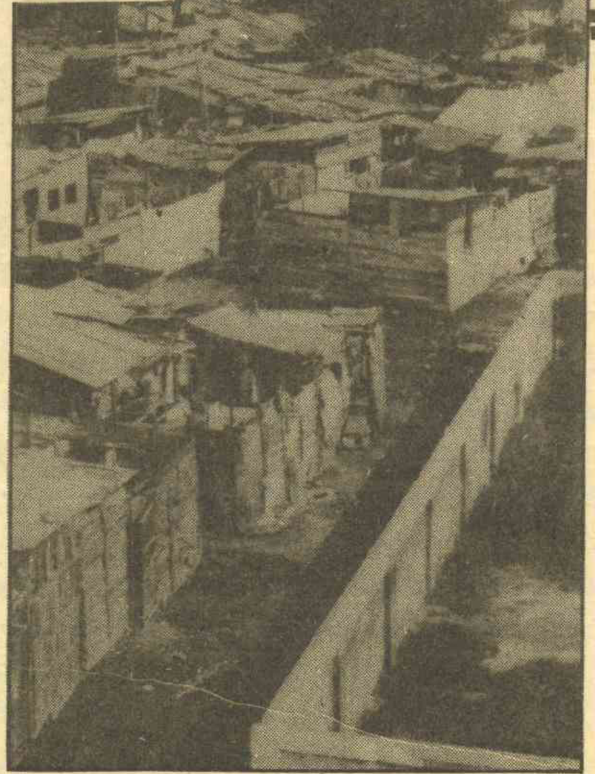
گوریلا اور ان کی پناہ گاہیں

پناہ دینے والی ایک جاندار اور موثر طاقت کی اہمیت کچھ کم نہیں ہوتی، اگرچہ یہ بات بھی ہے کہ گوریلا جنگ میں کامیابی کے لئے اسکی موجودگی لازمی نہیں۔ کیوبا، یوگوسلاویہ، اور چین میں انقلابیوں کی پشت پر انہیں پناہ دینے والی کوئی طاقت موجود نہ تھی۔ برما میں اور اس سے کسی قدر کم پیمانے پر یونان میں پناہ دینے والی طاقتوں کی افادیت بہت محدود رہی۔ سیاسی اور فوجی، دونوں اعتبار سے انقلابی گوریلا، بڑی حد تک خود کفیل ٹولیوں میں منظم ہوتے ہیں، چنانچہ سرحد پر اگر امداد کی ترسیل کا سلسلہ بند ہو جائے تو بھی، ان میں اتنی اہلیت ہوتی ہے کہ غیر معینہ مدت تک برابر لڑتے رہیں، تاہم باہر کی امداد، نفسیاتی اور سفارتی طور پر بیحد اہم قیاس کی جاتی ہے۔ اس طرح کی لمبی لڑائیوں میں کسی مضبوط غیر ملکی دشمن پر کوئی فیصلہ کن کامیابی حاصل نہیں ہوتی، البتہ زیادہ سے زیادہ یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ دشمن کو بھاری نقصان جگہ جگہ پہنچایا جائے، اسے لمبی لڑائی میں تھکا ڈالا جائے اور تب بین الاقوامی دباؤ کے ذریعے اسے واپسی کی بات چیت پر آمادہ کر لیا جائے۔ گوریلاؤں کے مطالبے کو بین الاقوامی اہمیت دینے کے لئے بیرونی امداد بیحد اہم ہوتی ہے۔ یہ امداد آزادی کی امید کو ہمیشہ تازہ رکھتی ہے۔ جب کوئی انقلابی فوج ایک حریف کی حمایت سے محروم ہو جائے تو اس کا نقصان فوجی لحاظ سے محرومی کی صورت میں ہی نہیں ہوتا، دراصل وہ امید کھو دیتی ہے جب اس طرف دنیا کی نظریں لگی ہوئی نہ ہوں۔ جب سفارتی احتساب کا خوف مانع نہ ہو اور جنگ کے وسیع علاقے میں پھیل جانے کا خطرہ موجود نہ ہو تو اس صورت میں یہ امکان پایا جاتا ہے کہ چھاپہ مار گوریلاؤں کے خلاف جنگ میں الجھنے والی غیر ملکی طاقت یقینی کامیابی کے لئے آخری اور فیصلہ کن چال اختیار کرے تب وہ انسانی آبادی کا قتل عام شروع کر دیتی ہے۔

گوریلا دستے باہر سے کنٹرول نہیں کئے جا سکتے

آخر میں، ہم اس مفروضے پر گفتگو کریں گے کہ روایتی فوجوں کی طرح گوریلا تنظیم کو بھی ایک غیر ملکی حکومت کے ذریعے یا ایک ایسی حکومت کے ذریعے جس کا مرکز ملک سے باہر ہو، کنٹرول کیا جا سکتا ہے اور اسکی کمان سنبھالی جا سکتی ہے، جو لوگ یہ باور کرتے ہیں، وہ انقلابی جنگ کے تنظیمی، نفسیاتی اور سیاسی حقائق کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ملک کے "اندرونی مرکز" پر کام کرنے والے گوریلا، خود اپنی حکومت کے بارے میں جو باہر جلاوطنی کی حالت میں کام کر رہی ہو، اتنی بداعتمادی میں مبتلا رہتے ہیں کہ اسے پوری طرح بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یا رسوخ اور جفاکش "اندرونی" رہنما اور کارکن، جو ہر روز دشمن سے مقابلہ کرتے ہیں۔ جو ٹیکس اکٹھا کرتے ہیں، انتظامی امور بجا لاتے ہیں، لوگوں سے وعدے وعید کرتے ہیں اور آبادی کے لوگوں کو کامیابی کی بشارت دیتے ہیں، ایسے لیڈروں اور کارکنوں کو باہر بیٹھ کر کنٹرول کرنا آسان نہیں ہوتا، ان کی حیثیت ایسے حلیفوں کی ہوتی ہے، جو ہمیشہ شک کرتے ہیں، اپنے مطالبوں میں سخت ہوتے ہیں اور انہیں مطمئن کرنا بیحد دشوار ہوا کرتا ہے۔

بستیاں کیسے اجڑتی ہیں بینک آباد کیسے ہوتے ہیں؟



یہ وہ نادار بستیاں
ہیں جن کے باشندوں
کی چھوٹی بچتیں،
اجارہ دار، سرمایہ داروں
کو پرشکوہ ایوانوں
اور دولت کے وسائل
کا مالک بناتی ہیں۔

محنت بونے اور بھوک کاٹنے والوں کو بینکوں سے کچھ نہیں ملتا

کراچی تیز روشنیوں اور پرشکوہ عمارتوں کا شہر ہے۔ ان میں بینکوں کی عمارتیں بھی شامل ہیں۔ بینک، سرمایہ دارانہ معیشت کے جسم میں دل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں محنت کش عوام کا خون اور پسینہ منافع، سود، بچت کی نالیوں سے داخل ہوتا ہے اور مزید اضافے، مزید لوٹ کے لئے قرضے، سرمایہ کاری وغیرہ کی شکل میں ملک کی مختلف صنعتوں میں چلا جاتا ہے۔ محنت کش اس سرمایہ میں اپنی محنت سے مسلسل اضافہ کرتا چلا جاتا ہے لیکن محنت بونے اور بھوک کاٹنے والے غریب عوام کو بینکوں میں گردش کرنے والے دولت کے انبار سے کچھ نہیں ملتا۔ سونے کے مول ڈگری حاصل کرنیوالے بابوؤں کی اکثریت یہاں صبح سے شام تک ہزاروں، لاکھوں روپیوں کے کڑکڑاتے ہوئے نوٹوں سے کھیلتی ہے اور شام کو گھر واپس ہوتے ہوئے انکی جیب ان کے پیٹ کی طرح خالی ہوتی ہے۔ دن بھر سرمایہ کی خدمت انجام دینے والے شام اس فکر میں سرگرداں رہتے ہیں کہ آنے والے دن کے لئے روٹی کا کیا ہوگا۔

حالیہ انتخابات میں جس قدر سیاسی پارٹیوں نے حصہ لیا ان میں سے بیشتر نے بینکوں کو قومی ملکیت میں لینے کا دیرینہ عوامی مطالبہ اپنے منشور میں شامل کیا ہے اور ملک کی فاتح دو بڑی سیاسی جماعتوں پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ نے تو بینکوں، بڑی صنعتوں، انشورنس کمپنیوں وغیرہ کو قومی ملکیت میں لینا اپنا اوّلین مقصد قرار دیا ہے۔ پاکستان کے بارہ کروڑ عوام نے جو ۲۳ سال سے افلاس پسماندگی اور بیروزگاری کی دلدل میں دھنستے چلے جارہے ہیں اب اُمید کرتے ہیں کہ یہ جماعتیں ان کے درد کا درماں کریں گی۔ بینکوں، انشورنس کمپنیوں اور پیداواری مسائل کو قومی ملکیت میں لینے کے عوامی مطالبے اور سیاسی پارٹیوں کے واضح اعلان کے پیش نظر یہ بات تقریباً یقینی معلوم ہوتی ہے کہ مستقبل کی حکومتیں بنیادی صنعتوں، بینکوں اور انشورنس کمپنیوں کو لازماً قومی ملکیت میں لے لیں گی۔

دولت کے ارتکاز اور مصنوعی ترقّی کے موجودہ نظام میں جس سے عوام کو کوئی فائدہ نہ ہوا، بینکوں نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے تقسیم ملک سے قبل پاکستان میں جتنے بینک قائم تھے تقریباً یہ سب ہندو سرمایہ داروں کے قبضے میں تھے بلکہ ان بینکوں میں کام کرنے والا عملہ بھی ہندو تھا۔ قیام پاکستان کے ساتھ ہی تقریباً تمام بینکوں نے اپنے ہیڈ آفس بھارت منتقل کر لئے۔ تقسیم سے قبل برصغیر میں مسلمان سرمایہ داروں کے صرف دو بینک تھے جن میں صرف حبیب بینک نے اپنا ہیڈ آفس پاکستان منتقل کیا۔ دوسرا آسٹریلیشیا بینک تھا جس کا صدر دفتر لاہور میں تھا۔

پاکستانی بینکاروں نے بیرونی امداد اور عوام کے اندھا دھند استحصال سے ترقّی کی ہے

ہمارے ملک میں بینکوں کو تین گروپوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ غیر ملکی بینک ہندوستانی بینک اور پاکستانی بینک۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد ہندوستان نے پاکستان میں اپنا بینکنگ کاروبار بند کر دیا۔ ۳۰ جون ۱۹۴۸ء کو پاکستان میں ۳۸ بینک اور ان کی ۱۳۷ شاخیں ملک کے اندر بینکنگ کا کاروبار انجام دے رہی تھیں جن میں صرف ۴ شیڈول

ملکی اور غیر ملکی بینک
کل ادا شدہ سرمایہ

۱۹۷۰ء میں بینکوں کی کل تعداد	۳۵
پاکستانی بینکوں کی تعداد	۱۶
غیر ملکی بینکوں کی تعداد	۱۹
کل کھاتہ دار	۸۰۷،۰۰۰
کل قرض جو جاری کیا گیا	۱۱۰۰ کروڑ
۴۲۲،۷ کھاتہ داروں نے جو قرض حاصل کیا	۹۲۰ کروڑ
۱۰۰ کھاتہ داروں کو جاری کیا جانیوالا قرض	۱۹۰ کروڑ

کرنٹ اکونٹ پر کوئی سود ادا نہیں کیا جاتا۔ جب کہ کرنٹ اکونٹ کل ڈپازٹ کا ۳۳ فیصد ہوتا ہے۔

۱۹۵۹ء میں پاکستانی بینکوں کا کل ادا شدہ سرمایہ	۸ کروڑ
۱۹۶۹ء میں پاکستانی بینکوں کا کل ادا شدہ سرمایہ	۱۴،۷ کروڑ

پاکستان میں سرمائے کی لوٹ کا ایک جائزہ

بینک اوران کی ۲۳ شاخوں پر پاکستانی سرمایہ کاروں کا کنٹرول تھا. لیکن بہت کم عرصے میں پاکستانی بینکاروں نے بیرونی امداد اور عوام کے اندھا دُھند استحصال کی بدولت ترقی کی چنانچہ ۳۰ جون ۱۹۶۸ء تک پاکستانی بینکوں کی تعداد ۱۵ تک پہنچ گئی جس کی ۲۴۵۷ شاخیں سارے ملک میں قائم ہو چکی تھیں. دسمبر ۱۹۶۹ء میں انکی تعداد ۲۷۶۶ تک پہنچ گئی۔ ۱۹۶۹ء میں اسٹاک ایکسچینج کی فہرست پر تیرہ ایسے اداروں کے نام درج تھے جو پاکستان میں بینکاری کی خدمات انجام دیتے ہیں. ان اداروں کے نام درج ذیل ہیں :-

(۱) آسٹریلیشیا بینک (۲) بینک آف بہاولپور (۳) کامرس بینک (۴) حبیب بینک (۵) انڈسٹریل ڈیولپمنٹ بینک (۶) پاکستان انڈسٹریل کریڈٹ اینڈ انوسٹمنٹ کارپوریشن۔ (۷) نیشنل کمرشیل بینک (۸) پریمیئر بینک (۹) اسٹینڈرڈ بینک (۱۰) اسٹیٹ بینک (۱۱) یونائیٹڈ بینک (۱۲) ایگریکلچرل ڈیولپمنٹ بینک (۱۳) ایسٹرن مرکنٹائل بینک اور ایسٹرن بینکنگ کارپوریشن

تیرہ بینکوں کا منظور شدہ سرمایہ ۳۵ کروڑ اور ادا شدہ سرمایہ ۲۶ کروڑ دس لاکھ روپے تھا. لیکن اب بینکنگ کے پاکستانی اداروں کی تعداد ۱۶ تک پہنچ گئی ہے جن کے ہیڈ آفس اور برانچوں کی تعداد کچھ یوں بنتی ہے۔

(تفصیل باقی صفحہ ۲۲ پر ملاحظہ فرمائیں)

وہی چند اجارہ دار خاندان قابض ہیں

پاکستانی بینکوں کی انتظامیہ پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ جو اجارہ دار خاندان دوسری صنعتوں پر قبضہ جمائے بیٹھے ہیں پاکستانی بینکوں پر بھی انہیں کا قبضہ ہے۔ ایوب آمریت نے مضبوط مرکز کے نام پر عوامی بے چینی کو دبایا اور سرمایہ داروں کو لوٹ کھسوٹ کے ایسے مواقع فراہم کر دیئے کہ بہت سے قلاش مختصر عرصے میں لکھ پتی اور کروڑ پتی بن گئے، آمریت کے خلاف جدوجہد کے دوران میں عوام کو پہلی بار یہ احساس ہوا کہ جس معاشی بدحالی کے دلدل میں وہ دھکیل دیئے گئے ہیں اسکی ذمہ داری محض فردِ واحد پر نہیں آتی بلکہ ان خرابیوں کا ذمہ دار پورا طبقہ ہے، اب ملک کی اکثریت کا نعرہ کسی فردِ واحد کو ہٹانے کا نعرہ نہیں رہا بلکہ پورے استحصالی نظام کے خاتمے کا نعرہ بن گیا۔ عوام کے اسی شعور کا نتیجہ ہے کہ ملک کی ہر سیاسی جماعت خواہ اس کا تعلق دائیں بازو سے ہو یا بائیں بازو سے وسائل پیداوار کو قومی ملکیت میں لینے کا مطالبہ کرنے پر مجبور ہو گئی. بینکوں کے بورڈ آف ڈائرکٹرز پر نظر ڈالیئے تو آپ کو وہی جانے پہچانے چہرے نظر آئیں گے جو ۳۰، اجارہ دار خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

مثال کے طور پر داؤد سیٹھ نے امریکہ میں فقط ڈیڑھ لاکھ کے سرمایہ سے ایک کمپنی بنائی جس کا نام انٹرنیشنل ٹریڈ ڈیولپمنٹ ایسوسی ایشن رکھا اس کمپنی میں سو سو ڈالر کے ۱۰۵۰ حصص داؤد برادران کے اور صرف ۴۴ حصص ایک امریکی تاجر کے تھے اس کمپنی کے نام پر نیشنل بنک سے بارہ لاکھ روپیہ قرض لیا گیا اور اس رقم سے ۱۶، امریکی جہاز خریدے گئے۔ اور انہیں چاٹگانگ لاکر اسکریپ کے طور پر فروخت کیا جائے گا۔ اور یوں بغیر کسی سرمایہ کے لاکھوں روپے کمائے جائیں گے۔ اسی طرح ہمارے یہاں کے بیشتر سرمایہ داروں نے بغیر کسی ذاتی سرمایہ کے کروڑوں روپے کمائے ہیں اور ان کی اس طلسماتی زر اندازی کا ذریعہ ہیں بنک اور انشورنس کمپنیاں۔

غیر ملکی بنکوں کی لوٹ

ہمارے ملک میں جو غیر ملکی بنک کاروبار کر رہے ہیں۔ چونکہ ان کے ہیڈ آفس اپنے اپنے ملکوں میں ہیں۔ لہٰذا ان کا کوئی ادا شدہ سرمایہ نہیں یہ بنک مقامی بچتوں ہی سے اپنا کاروبار کرتے ہیں ان بنکوں کی تعداد کی نسبت سے ان کا محفوظ سرمایہ انتہائی قلیل یعنے تقریباً ۳ کروڑ ہے۔ اگر بنکوں کو قومی ملکیت میں لینے کی پروگرام پر عملدرآمد کیا گیا تو غیر ملکی بنکوں کو معاوضے کے طور پر کوئی رقم دینے کی ضرورت نہیں پڑے گی کیونکہ ان کے محفوظ سرمایہ کی تشکیل مقامی بچتوں سے ہوتی ہے اور ان کا ادا شدہ سرمایہ کوئی نہیں! یہ غیر ملکی بنک تو محض پاکستانی سرمایہ سے کاروبار کر رہے ہیں اور منافع حاصل کر رہے ہیں۔ ایسے بنکاروں کو معاوضہ دینے کا نہ کوئی اخلاقی جواز ہے نہ قانونی جنہوں نے بغیر کسی سرمایہ کے دولت کے انبار جمع کر لئے ہیں۔ مشرق وسطیٰ کے ملکوں میں زیادہ تر بینکوں کو معاوضہ دیئے بغیر قومی ملکیت میں لے لیا گیا ہے

فرسٹ سٹی نیشنل بنک

اجارہ دار سرمایہ دار کسی ذاتی سرمایہ کے بغیر بینکوں کے روپے سے غیر ملکی تجارت اور کاروبار کے ہر شعبے پر قابض ہوتے جا رہے ہیں

بینک اپنے ۹۸ فیصد اکاؤنٹ ہولڈروں کو نظر انداز کر کے دو فیصد سرمایہ داروں کو اسّی فیصد قرض دیتے ہیں

مارچ ۱۹۷۰ء تک بینکوں کے اکاؤنٹ ہولڈروں کی مجموعی تعداد تقریباً ۸ لاکھ تھی۔ ان میں ۷ لاکھ ۹۰ ہزار اکاؤنٹ ہولڈر وہ تھے۔ جن کے سرمایہ کی مقدار ایک ہزار سے ۵۰ ہزار تک ہے یہ تعداد کل اکاؤنٹ ہولڈروں کا ۹۸ فی صد حصہ بنتی ہے لیکن ان ۹۸ فی صد اکاؤنٹ ہولڈروں نے صرف ۲۰ فی صد قرض کی سہولتیں حاصل کیں اور محض ۴۲۲۷ افراد نے جو کل اکاؤنٹ ہولڈروں کا ۲ فیصد حصہ ہیں۔ قرض کی مد میں ۹۲۷ کروڑ روپے حاصل کئے جو کل سرمایے کا تقریباً ۸۰ فیصد ہے اس طرح بنک اپنے ۹۸ فی صد اکاؤنٹ ہولڈروں کو نظر انداز کرتے ہیں اور دو فیصد سرمایہ داروں کو سرمائے کی سہولت بہم پہنچاتے ہیں۔ ان میں بھی اصل فائدہ مٹھی بھر سرمایہ دار خاندان حاصل کرتے ہیں جو ملکی معیشت پر سانپ بنے بیٹھے ہیں وہ نہ صرف ملک کے صنعتی اداروں بیرونی تجارت درآمد و برآمد کے جیسے اہم شعبوں پر قابض ہیں بلکہ ملک کے زیادہ تر بینکوں پر انہیں لوگوں کا قبضہ ہے۔ ہمارے ملک کا محنت کش طبقہ اپنی محنت سے جو دولت پیدا کرتا ہے وہ گھوم پھر کر آخر کار بینکوں میں پہنچ جاتی ہے۔ خصوصاً درمیانہ درجہ کے کاروباری لوگوں کی بچت بینکوں کے سرمایہ کا بنیادی حصہ ہوتی ہے۔ معمولی سے سود کا لالچ دے کر بنکوں کے مالک ساری بچتیں حاصل کر لیتے ہیں۔ بنکوں میں جمع ہونے والی دولت کا مصرف یہ ہوتا ہے کہ اسے ملک کی مزید ترقی کے لئے نئے نئے ترقیاتی منصوبوں میں لگایا جائے۔ لیکن کاروباری زندگی کے ہر شعبہ پر چند اجارہ دار خاندانوں کا قبضہ ہے اس وجہ سے چھوٹے کاروباری لوگوں اور صنعتکاروں کو قرض دینے کے بجائے یہ اجارہ دار خاندان اس سرمایہ کو اپنے ہی مختلف کاروبار میں استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح بیرونی امداد بھی عام طور پر انہی مٹھی بھر خاندانوں کے تصرف میں رہتی ہے۔ یہ لوگ بغیر ملکی ذاتی سرمایہ کے ہر سال نہ صرف کروڑوں روپے منافع کی شکل میں حاصل کرتے ہیں بلکہ آہستہ آہستہ اس سرمایہ کی مدد سے کاروبار کے ہر شعبہ پر اپنی اجارہ داری قائم کرتے آئے ہیں۔

شیڈول بینکوں کی فہرست

پاکستانی بینک	شاخیں	ہیڈ آفس
۱۔ ایگریکلچرل ڈویلپمنٹ بینک آف پاکستان	۱۵۱	شفیع کورٹ کراچی
۲۔ آسٹریلیشیا بینک لمیٹڈ	۱۳۹	لاہور (گارڈین ٹرسٹ بلڈنگ نیپیر روڈ)
۳۔ بینک آف بہاولپور لمیٹڈ	۵۳ کل	بہاولپور (البغداد الجدید)
۴۔ کامرس بینک لمیٹڈ	۱۱۸	نیوجوبلی انشورنس ہاؤس میکلوڈ روڈ۔ کراچی
۵۔ ایسٹرن بینکنگ کارپوریشن لمیٹڈ	۵۹	۱۲۵۔ موتی جھیل ڈھاکہ
۶۔ ایسٹرن مرکنٹائل بینک لمیٹڈ	۱۰۶	۹۹۔ آگرآباد کمرشیل ایریا۔ چٹاگانگ
۷۔ حبیب بینک لمیٹڈ	۷۱۰	حبیب اسکوائر۔ کراچی
۸۔ انڈسٹریل ڈویلپمنٹ بینک آف پاکستان	۱۱	ڈھاکہ (موتی جھیل)
۹۔ لاہور کمرشیل بینک لمیٹڈ	۸	۳۰۔ نیپیر روڈ۔ لاہور
۱۰۔ مسلم کمرشیل بینک لمیٹڈ	۳۵۶	آدمجی ہاؤس میکلوڈ روڈ۔ کراچی
۱۱۔ نیشنل بینک آف پاکستان	۷۲۹	میکلوڈ روڈ۔ کراچی
۱۲۔ اسٹینڈرڈ بینک لمیٹڈ	۱۴۳	محمدی ہاؤس، میکلوڈ روڈ۔ کراچی
۱۳۔ یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ	۵۷۳	امریکن لائف انشورنس بلڈنگ میکلوڈ روڈ کراچی
۱۴۔ یونین بینک لمیٹڈ	۵۰	(یونائیٹڈ بینک کا ذیلی ادارہ)
۱۵۔ سرحد بینک لمیٹڈ	۱۵	
۱۶۔ پریمیئر بینک لمیٹڈ	۱۲	

(ب) غیر ملکی بینک	شاخیں
۱۔ الجیمنی بینک آف نیدرلینڈ	۱
۲۔ امریکن ایکسپریس بینکنگ کارپوریشن	۴
۳۔ بینک آف امریکہ	۳
۴۔ بینک آف جاپانا	۲
۵۔ بینک آف ٹوکیو لمیٹڈ	۱
۶۔ دی چارٹرڈ بینک	۴
۷۔ ڈیوش ایشیاٹک بینک (جرمن بینک)	۱
۸۔ ایسٹرن بینک لمیٹڈ (کاروبار بند کر دیا)	۱
۹۔ فرسٹ نیشنل سٹی بینک	۲
۱۰۔ نیشنل اینڈ گرانڈلیز بینک لمیٹڈ	۲۵

ڈائرکٹروں کے نام

ایگریکلچرل ڈویلپمنٹ بینک آف پاکستان

۱۔ ایم۔ اے۔ ایچ۔ قریشی — چیئرمین
۲۔ محبوب العالم۔ چٹاگانگ — "
۳۔ غلام معین الدین۔ لاہور — "
۴۔ اے۔ ایف۔ ایس صلاح الدین (جائنٹ سیکرٹری۔ وزارت خارجہ) — "
۵۔ اے۔ سمیع قریشی (جائنٹ سیکرٹری۔ وزارت زراعت) — "
۶۔ صلاح الدین احمد (سکریٹری محکمہ زراعت حکومت مشرقی پاکستان) — "

آسٹریلیشیا بینک لمیٹڈ

۱۔ میاں فاروق احمد — چیئرمین
۲۔ میاں ہدایت علی طیب — ڈائرکٹر
۳۔ میاں غلام محمد قریشی — "
۴۔ کرنل اسلم عزیز شیخ — "
۵۔ نجم الدین ولی بھائی — "
۶۔ تاج محمد خان زادہ — "
۷۔ بیگم ثریا فاروق — "
۸۔ حبیب الرحمٰن — "
۹۔ ایم۔ اے۔ کے۔ یوسفی — مینجنگ ڈائرکٹر

بینک آف بہاولپور

۱۔ حمید الدین بیسر — چیئرمین و مینجنگ ڈائرکٹر
۲۔ خان بہادر حسیم الدین احمد — ڈائرکٹر
۳۔ نوابزادہ محمد منیر خان ہوتی — "
۴۔ محمد یوسف، لیفٹننٹ جنرل — "
۵۔ ایم۔ صدیق چوہدری — "
۶۔ ارشاد احمد — "
۷۔ سعید اختر مراد — "
۸۔ سید عبدالعزیز — "
۹۔ میر خلیل الرحمٰن (جنگ) — "
۱۰۔ یوسف دادا — "
۱۱۔ ظفر الاحسن — "

کامرس بینک لمیٹڈ

۱۔ مسٹر امیر علی ایچ فینسی — چیئرمین
۲۔ میاں محمد بشیر — ڈائرکٹر
۳۔ مسٹر اے۔ احمد — "
۴۔ مسٹر میر اللہ بچایو خان تالپور — "
۵۔ مسٹر لطیف ابراہیم جمال — "
۶۔ مسٹر عبدالحمید حسن علی — "
۷۔ مسٹر انور تابل — "
۸۔ مسٹر محمد بھائی — "
۹۔ جی ایچ فینسی — "
۱۰۔ مسٹر ایم۔ اسلم صدیقی — "

ایسٹرن بینکنگ کارپوریشن لمیٹڈ

۱۔ مسٹر نور الامین — چیئرمین
۲۔ آفتاب الدین احمد — ڈائرکٹر
۳۔ عطاء اللہ — "
۴۔ نور السلام چوہدری — "
۵۔ احمد علی سرکار — "
۶۔ اے۔ یو۔ محمد خلیل اللہ — ڈائرکٹر
۷۔ قاضی مصباح الدین احمد — "
۸۔ شفقت چوہدری — "
۹۔ نواب خواجہ حسن عسکری — "
۱۰۔ حبیب الرحمٰن بھنڈاری — "
۱۱۔ ایم۔ ایم۔ عالم — "
۱۲۔ ڈاکٹر جے۔ سی۔ دیوناتھ — "
۱۳۔ ضیاء الحق — "
۱۴۔ اے۔ این۔ حمید اللہ — مینجنگ ڈائرکٹر

ایسٹرن مرکنٹائل بینک لمیٹڈ

(اس بینک میں اسٹیٹ بینک آف پاکستان کا ۴۰ فیصد سرمایہ لگا ہوا ہے۔ اس لئے یہ بینک حکومت کے زیر اثر ہے)

۱۔ سبط الرحمٰن — چیئرمین
۲۔ اے۔ ایف۔ ایم نور الامین — ڈائرکٹر
۳۔ ایم۔ آر۔ صدیقی — "
۴۔ ڈاکٹر نعیم الحق — "
۵۔ اے۔ سلام — "
۶۔ الحاج ایم۔ ایچ۔ چوہدری (ایم پی اے) — "
۷۔ ایس ایم حسین — "
۸۔ منظور الرحمٰن — "

حبیب بینک لمیٹڈ

۱۔ احمد حبیب — چیئرمین
۲۔ حامد۔ ڈی۔ حبیب — وائس چیئرمین
۳۔ رزاق ایچ محمد — پریذیڈنٹ
۴۔ حیدر ایم۔ حبیب — مینجنگ ڈائرکٹرز
۵۔ رشید ڈی حبیب — "
۶۔ یوسف قاسم — "
۷۔ فدا حسین آئی۔ حاجی — "
۸۔ یوسف اے حبیب — "
۹۔ رحیم علی جی۔ چھاگلہ — "
۱۰۔ حاجی جان محمد حاجی دادو — "
۱۱۔ محمد رفیق حاجی امیر الدین — "

انڈسٹریل ڈویلپمنٹ بینک آف پاکستان

۱۔ مسٹر کے۔ اے۔ مارکر — چیئرمین
۲۔ " زیڈ حق — مینجنگ ڈائرکٹر
۳۔ اسد علی شاہ سی ایس پی — ڈائرکٹر
۴۔ محمد سعید الزماں — "
۵۔ اے۔ ایم۔ سعید — ڈائرکٹر
۶۔ ڈاکٹر اے۔ وحید — "
۷۔ احمد حسین — "
۸۔ ایم۔ جی۔ دستگیر — "
۹۔ مسز انورہ بیگم — "
۱۰۔ جی۔ آر۔ ارشد — "
۱۱۔ میاں اللہ بخش — "

لاہور کمرشیل بینک لمیٹڈ

۱۔ رانا عبدالحمید خاں — چیئرمین
۲۔ رانا خدا داد خاں — ڈائرکٹر

۳۔ میاں محمد احمد 〃
۴۔ سید صادق حسین شاہ 〃
۵۔ چوہدری علی محمد 〃
۶۔ ایم نومان جان ارکن 〃
۷۔ نثار حسین ملک 〃
۸۔ ایم اے فاروق مینجنگ ڈائریکٹر

مسلم کمرشیل بینک لمیٹڈ

۱۔ عبدالوحید آدم جی چیئرمین
۲۔ عبدالغنی حاجی حبیب ڈائریکٹر
۳۔ فخرالدین ولی بھائی 〃
۴۔ ایم۔ ایم اصفہانی 〃
۵۔ ذکریا آدم جی 〃
۶۔ گل محمد 〃
۷۔ ایس مصطفےٰ اسمٰعیل مینجنگ ڈائریکٹر

نیشنل بینک آف پاکستان

سنٹرل بورڈ آف ڈائرکٹر

۱۔ انور قادر مینجنگ ڈائرکٹر
۲۔ عبدالحمید ڈائریکٹر
۳۔ میر خلیل الرحمٰن 〃
۴۔ جاوید سہگل 〃
۵۔ ابوطالب دادا 〃
۶۔ ایس سی 〃
۷۔ میر افضل خاں 〃
۸۔ اے ایس محمود چوہدری 〃
۹۔ اے ایچ ایم دادا بھائی 〃
۱۰۔ خاں امیر عبداللہ خاں روکھری 〃
۱۱۔ مسز انورہ بیگم 〃
۱۲۔ چوہدری محمد سرور 〃

اسٹینڈرڈ بینک آف پاکستان

۱۔ انعام الرحمٰن مینجنگ ڈائرکٹر
۲۔ اشرف الزماں ڈائریکٹر
۳۔ ایم یاسین چوہدری 〃
۴۔ ریاض شفیع 〃
۵۔ غلام علی الانا 〃
۶۔ افتخار احمد سرمد 〃

یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ

۱۔ حبیب۔ آئی۔ رحمت اللہ چیئرمین

۲۔ میاں۔ ایم اقبال سہگل ڈائریکٹر
۳۔ سلطان مادٔجی 〃
۴۔ ای۔ ڈی۔ ایم ڈنشا 〃
۵۔ ایم فاروق سہگل 〃
۶۔ عبدالرزاق دادا 〃
۷۔ اے۔ ایم۔ اے۔ کبیر 〃
۸۔ آغا حسن عابدی مینجنگ ڈائریکٹر

ماتحت بینک

۱۔ یونین بینک لمیٹڈ
۲۔ بیروت یونیورسل بینک لبنان

پریمیئر بینک لمیٹڈ

آدم جی پارس۔ میکلوڈ روڈ۔ کراچی

۱۔ احمد۔ ایچ۔ حبیب چیئرمین



۲۔ عبدالرحمٰن۔ ایچ۔ حبیب ڈائریکٹر
۳۔ قاسم۔ ایچ حبیب 〃
۴۔ امیر۔ ایس۔ چنائے 〃
۵۔ ولی امام 〃
۶۔ کے۔ ایم ماجد 〃
۷۔ قمرالدین۔ فخرالدین 〃
۸۔ ایم۔ ایم۔ علی اصفہانی 〃
۹۔ اخلاق احمد 〃
۱۰۔ نعیم ارشد 〃
۱۱۔ ایم۔ افضال خاں 〃

سرحد بینک لمیٹڈ

۷۹۔ جی ٹی۔ روڈ۔ پشاور

۱۔ مسٹر جی۔ فاروق چیئرمین
۲۔ 〃 ایس۔ بھول بادشاہ ڈائریکٹر
۳۔ 〃 آئی۔ اے۔ حنفی 〃
(اسٹیٹ بینک)
۴۔ جمیل نشتر ڈائریکٹر
۵۔ محمد سلیمان 〃
۶۔ کے ایس سرور جان خاں 〃
۷۔ ایس۔ تجمیر شاہ 〃
۸۔ محمد فاروق 〃
۹۔ الحاج خان شیر افضل خاں 〃
۱۰۔ الحاج سردار عبداللہ خاں 〃
۱۱۔ الحاج خان محمد ہارون خاں 〃
۱۲۔ الحاج خان عثمان علی خاں 〃

پبلک لمیٹڈ بنکوں میں مالکان شیر ہولڈرز کا لگا ہوا کل سرمایہ

جاری کردہ وادا شدہ سرمایہ

۱۔ آسٹریلیشیا بنک	۵،۴۰۰،۰۰۰	روپے
۲۔ بنک آف بہاولپور	۵۰،۰۰۰،۰۰۰	〃 〃
۳۔ کامرس بنک	۲،۰۰،۰۰۰،۰۰۰	〃 〃
۴۔ حبیب بنک	۹،۰۰،۰۰،۰۰۰	〃 〃
۵۔ آنڈسٹریل ڈیولپمنٹ بنک	۵۰۰،۰۰،۰۰۰	〃 〃
۶۔ مسلم کمرشل بنک	۲،۲۵،۰۰،۰۰۰	〃 〃
۷ نیشنل بنک	۳،۰۰،۰۰،۰۰۰	〃 〃
۸ پریمئیر بنک	۵۰،۰۰،۰۰۰	〃 〃
۹ سرحد بنک	۵۰،۰۰،۰۰۰	〃 〃
۱۰ اسٹینڈرڈ بنک	۷۵،۰۰،۰۰۰	〃 〃
۱۱ یونائیٹڈ بنک	۴،۱۰،۰۰،۰۰۰	〃 〃

بنکوں میں ڈپازٹ کی صورت حال

کروڑوں میں۔

سال	ڈپازٹ	ایڈوانس
۱۹۶۱	۳۴۲٫۹۰	۱۹۴٫۰۳
۱۹۶۲	۳۶۷٫۹۱	—
۱۹۶۳	۴۶۷٫۰۷	۳۳۰٫۸۰
۱۹۶۴	۵۷۶٫۰۸	۴۳۴٫۱۹
۱۹۶۵	۶۷۶٫۰۸	۵۹۰٫۱۸
۱۹۶۶	۸۱۴٫۹۶	۶۳۱٫۶۶
۱۹۶۷	۷۴۲٫۹۷	۸۲۰٫۷۸
۱۹۶۸	۱۰۹۸٫۰۲	۹۴۱٫۲۲
۱۹۶۹	۱۱۴۱٫۱۳	۹۸۵٫۹۶

ایک سیاسی وتاریخی افسانہ

خورشید الحسن نادان

روح کے بیوپاری

دوپہر کا وقت تھا خطِ استوا پر سورج کی چمکیلی کرنیں سیدھی پڑ رہی تھیں۔

ایک تنگ سے راستے پر دونوں طرف اونچے اونچے پام اس طرح سر جوڑے کھڑے تھے کہ دھوپ کی ایک رمق بھی اُن کے گھنے پتّوں سے ہو کر نہیں گذر سکتی تھی۔ اُنکے سایہ میں ہلکا ہلکا اندھیرا تھا اور وسیع خلاء کا سا سنّاٹا.... ایک بوسیدہ لکڑی کے ٹکڑے پر بڑی سی سیاہ تتلی بیٹھی ہوئی تھی۔ پاس ہی ایک پتّھر کو تکیہ بنائے ہوئے گُمشلا لیٹا تھا۔

گمشلا اچھّی خاصی پُر تکلّف زندگی بسر کرتا تھا۔ وہ کوٹ پتلون پہنتا تھا۔ بندر کی کھال کے دو ہیٹ اُسکے پاس تھے اور ایک سائیکل بھی تھی۔ اس کے کوارٹر میں چارپائی اور بستر تھا۔ میز کرسی تھی، غسل خانہ تھا، اور وہ کافی صاف ستھرا اور سلیقہ مند آدمی تھا۔ پھر بھی جب وہ نرسری میں کام کرتے کرتے تھک جاتا تو پتّھر کو سر کے نیچے تکیے کی طرح جما کر زمین پر لیٹ جاتا تھا۔ زمین پر لیٹنے میں اسے بڑا سکون ملتا تھا۔ کھردری زمین پر جب وہ اپنے بدن کو پھیلا دیتا تو اُسے محسوس ہوتا، جیسے چھوٹے چھوٹے کنکر اور پتّھر اُس کے تھکے ہوئے جسم کو سہلا رہے ہوں ـــــ سُرخ مٹّی سے اُٹھتی ہوئی زنگ آلود لوہے اور سیلن کی بُو اور باریک کنکروں کی چبھن میں اُسے بیحد اپنائیت اور مامتا کا احساس ہوتا۔ وہ اپنے آپ کو زمانہ کی ساری آفتوں اور آلائشوں سے آزاد ایک ننھّا مُنّا سا بچّہ محسوس کرتا اور اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑ کر آنکھیں بند کر لیتا اور اونگھنے لگتا اور اونگھتے اونگھتے سو جاتا اور سوتے سوتے رنگین اور رسیلے خواب دیکھنے لگتا۔

لیکن آج گمشلا کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ اُس کے دماغ میں چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں اور اُسے یوں لگ رہا تھا، جیسے کئی آدمی اُس کی کھوپڑی پر منگو تلی کا رقص کر رہے ہوں۔ گمشلا بڑی سیدھی سادی زندگی بسر کرتا تھا۔ سوچنے اور فکر کرنے کی اُسے عادت نہ تھی۔ نہ ماضی کا ملال نہ حال کی فکر نہ مستقبل کا اندیشہ۔ لیکن آج اُس کے ذہن کے پردہ پر ماضی حال اور مستقبل سب گڈمڈ ہو رہے تھے۔ اُس کے ذہن کی کیفیت دریائے کانگو کے تیز و تند دھارے کی طرح تھی۔

گمشلا کانگو کے کنارے بتا تامی قصبے میں پیدا ہوا تھا۔ جن دنوں وہ ایک ننھا سا بچّہ تھا ماں اُسے ساتھ لے کر گوروں کے فارم میں جاتی تھی۔ وہاں پام اُگائے جاتے تھے۔ پام کے چھوٹے چھوٹے پودوں میں، جب چار چار پتّیاں نکل آتیں تو اُس کی ماں ان پودوں کو سایہ دار نرسری میں لگا دیتی تھی۔ نرسری کے جو پودے ایک ایک سال کے ہو جاتے تھے، اُن کو فارم میں اُن کی مستقل جگہوں پر لگا دیا جاتا تھا۔ جب پام پانچ سال کا ہو جاتا تھا تو اُس میں پھل آنے لگتے تھے۔ گمشلا پام کے سایہ میں پلا تھا اور پام کی زندگی کے مختلف دور اُس کی آنکھوں کے سامنے سے گزرے تھے جب وہ ذرا بڑا ہو گیا تو اُسے بھی فارم میں نوکری مل گئی۔ اس کا کام اونچے اونچے پام کے درختوں پر چڑھ کر اُن کے پھل توڑنا تھا جب وہ درخت اور اپنی کمر کے گرد کمبا ڈال کر دونوں ہاتھوں سے اُسے پکڑ کر جھٹکا دیتا تو کمبا۔ اُچھل کر پام کے تنے میں نکلے ہوئے کنگروں میں پھنس جاتا اور وہ بندروں کی سی تیزی سے اوپر اُچھل کر پام کے تنے میں اپنے پیر پھنسا لیتا اور پھر اُسی طرح اور اوپر اور اوپر یہاں تک کہ زمین پر کھڑے ہوئے گورے اور کالے لوگ چھوٹے چھوٹے تارے بن جاتے اور اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ پام کے تنے پر چڑھتے چڑھتے آسمان کو چھو لے گا۔

ایک دفعہ جب گمشلا نے پام پر چڑھ کر پھلوں کو توڑنے کے لئے ہاتھ ڈالا تو پتّوں میں چھپے ہوئے ایک سانپ نے اُس کی اُنگلی میں کاٹ لیا۔ اُس دن وہ زمین پر گرتا اور اُسکی ہڈی پسلی سُرمہ بن جاتی۔ لیکن خوش قسمتی سے اُس کی ایک ٹانگ پام کے پتّوں میں اُلجھ کر رہ گئی۔ گھاس اور چھال کے بنے ہوئے کمبے نے بھی کچھ سہارا دیا اور وہ اُس وقت تک وہیں لٹکتا رہا جب تک کہ فارم کے ایک ملازم نے بحفاظت اُسے نہ اُتار لیا۔ اُس کے بعد گمشلا پام پر نہیں چڑھا۔ اُس کی ماں کی سفارش پر ایک گورے نے گمشلا کو زرعی تربیت کے اسکول میں بھیجدیا۔ یہاں اُس نے دو سال تک تربیت پائی اُس کے بعد "موسیو ڈی بلینک" کے فارم میں نوکری کر لی۔

"موسیو ڈی بلینک" ایک ادھیڑ عمر کے سابق فوجی تھے۔ وہ ریٹائر ہو کر بلجیم گئے تو وہاں اُن کا جی نہ لگا۔ لہٰذا افریقہ واپس آ گئے۔ اُن کی بیگم افریقہ کے طوفان، شدید موسم درندوں اور جانور نما انسانوں سے بیحد خائف اور بیزار تھیں، اور کسی قیمت پر افریقہ واپس نہیں آنا چاہتی تھیں، انہوں نے موسیو ڈی بلینک سے طلاق لینا گوارا کر لیا ـــــ اور موسیو افریقہ آ گئے۔

وہ ایک خوبصورت اور جدید طرز کے بنگلہ میں تنہا رہتے تھے۔ اُن کا گھر جدید ترین سامانِ آسائش و آرائش سے مزیّن تھا۔ ان کے کے لئے کپڑے، شراب، سگار، صابن اور جوتوں کی پالش بھی خاص طور سے یورپ سے آتی تھی ان کے یہاں اکثر بڑے شاندار ڈنر اور رایٹ ہوم ہوتے تھے، جن میں وہ آس پاس کے تمام گوروں کو مدعو کیا کرتے تھے۔ وہ افریقہ میں رہتے ہوئے یورپی طرز کی زندگی بسر کرتے تھے اور اس پر انہیں غیر معمولی فخر تھا۔ اُن کی بہترین خواہش تھی کہ افریقہ میں ایسی تمام چیزیں فراہم کر لیں، جو برسلز، پیرس، لندن، یا واشنگٹن میں مہیا ہو سکتی ہیں۔

"موسیو ڈی بلینک" ایک بہت بڑے فارم اور پام کی تیل فیکٹری کے مالک تھے۔ کمینا کی ہیرے کی کان میں بھی انہوں نے کافی حصّے خرید رکھّے تھے۔ وہ اپنے فارم میں نئے نئے زراعتی تجربے کرتے رہتے تھے۔ کافی اور کوکو اُگانے کے کامیاب تجربہ کرنے کے بعد اُنہوں نے دو نئے تجربے شروع کئے تھے۔ ایک تو وہ پستہ قد پام اُگانے کا تجربہ کر رہے تھے، جن کے پھل توڑنے میں آسانی ہو اور جان جوکھوں میں نہ ڈالنا پڑے۔ دوسرے وہ افریقہ کی سرزمین پر ڈاہلیا کے پودے اُگانا چاہتے تھے۔ موسیو کا خیال تھا ان کے بنگلہ میں اگر کسی چیز کی کمی ہے تو ڈاہلیا کے پھولوں کی۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے.... جب تک افریقی سرزمین پر ڈاہلیا کے پھول نہ اُگیں گے، یہ برّ اعظم غیر مہذّب رہے گا۔

موسیو اپنے اس مجنونانہ شوق کی خاطر خاصی دولت اور محنت صرف کر چکے تھے۔ اُنہوں نے ڈاہلیا کے بیج بارہا یورپ سے منگوا کر لگائے جن سے چھوٹی چھوٹی سی کونپلیں نکلیں لیکن مرجھا کر رہ گئیں۔ اپنے ذاتی تجربے اور کوششوں سے ناکام ہو کر اُنہوں نے فرانس سے ایک ایکسپرٹ کو بلایا، کئی دن تک مٹّی اور موسم کا تجربہ کرنے کے بعد ایکسپرٹ نے ایک طویل تحریری رپورٹ میں بتایا کہ افریقہ کی مٹّی میں لوہا، کافی مقدار میں شامل ہے اور فاسفورس اور پوٹاشس بالکل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ حدّت اور نمی اس قدر ہے کہ ڈاہلیا بالکل ہی نہیں پنپ سکتا۔ اس کا خیال تھا کہ افریقہ میں ڈاہلیا ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں پیدا ہو سکتا ہے بشرطیکہ

موسیوڈی بلینک نے کہا، ہم نے افریقہ کو دریافت کیا ہے، ہم اس دریافت کو ضائع نہیں ہونے دینگے

اسے گملوں میں لگایا جائے اور گملوں میں یورپ کی مٹی ہو۔

موسیو ڈی بلینک اس ایکسپرٹ سے بہت مایوس ہوئے لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری بلکہ ان کا ضبط زیادہ بڑھ گیا۔ اب وہ پستہ قد پام اُگانے کے تجربے سے بالکل ہی بے نیاز ہو گئے تھے اور دن رات ڈاہلیا کی فکر میں رہتے تھے۔ امریکہ سے پست قد پاموں کے جو بیج آئے تھے ان کو درختوں کے سائے میں بو دیا گیا تھا، لیکن ان کی حفاظت اور دیکھ بھال گمشلا پر چھوڑ دی گئی تھی۔ موسیو نے کبھی ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ مختلف ملکوں کے موسم اور مٹی کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے بعد موسیو نے آسٹریلیا سے ڈاہلیا کے بیج منگوائے۔ یہ بیج پام کے سائے میں پستہ قد پاموں کے تختے کے برابر ہی ایک تختے پر بو دیئے گئے۔ موسیو دن میں کئی کئی بار آ کر ان کی دیکھ بھال کرتے رہے۔

اسی زمانہ میں افریقہ میں خاصا سیاسی خلفشار پھیل گیا تھا۔ افریقہ دنیا بھر کی نظروں کا مرکز بنتا جا رہا تھا۔ ایک دن ایک برطانوی صحافی اپنی بیوی کے ہمراہ مبالا آیا۔ موسیو ڈی بلینک نے اسے اور شہر کے دوسرے معزز گوروں کو رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ کھانے کے بعد سب لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ گمشلا پاس ہی برآمدے میں بیٹھا ہوا پام کے پتوں سے ایک ہیٹ بنانے میں مصروف تھا۔ وہ یہ ہیٹ مہمان صحافی کو تحفہ میں پیش کرنا چاہتا تھا۔ ڈرائنگ روم میں ہونے والی باتیں اسے صاف سنائی دے رہی تھیں ... مہمان صحافی کی بیوی افریقہ سے خاصی اکتائی ہوئی لگتی تھی۔ وہ موسیو ڈی بلینک کے خوش وضع بنگلے اس کی زیبائش و آرائش، مغربی کھانے اور فرانسیسی اور پرتگالی شراب کی بہت تعریفیں کر رہی تھیں۔

"خاتون نے کہا" موسیو ڈی بلینک افریقہ کے اس لق و دق صحرا میں آپ کا بنگلا جدید تہذیب کا ایک چھوٹا جزیرہ ہے یہاں آ کر میں بالکل بھول گئی ہوں کہ میں افریقہ میں ہوں"۔

موسیو ڈی بلینک اِٹھلا کر بولے مادام ابھی یہاں ایک چیز کی کمی ہے افریقہ کے کرخت گرانڈیل اور ہیبت ناک مناظر کی بیزار کن یک رنگی صرف ایک چیز سے دور ہو سکتی ہے اور وہ ہے ڈاہلیا جب تک یہاں ڈاہلیا کے خوش رنگ پھول نہ ہوں۔ افریقہ مہذب اور خوش ذوق لوگوں کے لئے موزوں نہیں ہو سکتا۔"

"ہونہہ ڈاہلیا" برطانوی صحافی نے حقارت سے کہا "تم نے یہاں سڑکیں بنائیں، ریلیں چلائیں، ہسپتال بنائے اسکول کھولے اور صنعتیں قائم کیں۔ لیکن اس کے صلے میں تمہیں کیا ملا؟ آج ساری دنیا تمہیں سامراجی کہتی ہے اور نفرت کی نظروں سے دیکھتی ہے تم اپنے بیوی بچوں سے جدا اور وطن سے دور وحشیوں، دشمنوں اور خونخوار درندوں اور تپتے ہوئے صحراؤں اور گھنگھور جنگلوں میں زندگی کے شدائد برداشت کرتے ہو۔ تاکہ اس تاریک براعظم میں تہذیب کی شمع روشن کرو اور یہاں کے انسانوں کو درندوں کی سطح سے بلند کر کے انسانوں کی طرح رہنا سکھاؤ۔ اور مہذب دنیا اس کے صلہ میں تمہارے سینہ پر سامراجی کا لعنتی تمغہ لگا دیتی ہے"۔

موسیو ڈی بلینک نے برطانوی صحافی کو ٹوکتے ہوئے کہا "نہیں جناب ہم اس طرح نہیں سوچتے ساری دنیا اور اقوام متحدہ آج ہمیں مطعون کر رہی ہے لیکن جب نئے افریقہ کی تاریخ لکھی جائے گی تو ہمارا ذکر اس میں سنہری الفاظ میں ہو گا۔

"تاریخ ؟" برطانوی صحافی نے بیزاری سے کہا "افریقہ کی تاریخ!! میرے دوست ایسی کوئی چیز کبھی وجود میں نہ آئے گی۔ کیا ٹمبکٹو نے عہد قدیم میں تہذیب و تمدن کا مرکز نہیں رہا کیا افریقہ میں زمبابوی کا پُر شکوہ قلعہ اور محلات تعمیر نہیں ہوئے تھے کیا آلف اور بنین میں تہذیب نہیں تھی کیا زمبیزی کا سونا اور ٹرانسوال کا ٹین نکالنے والے لوگ یہاں شمال مشرق سے کبھی نہیں آئے آج ان کی کوئی نشانی، کوئی یادگار کیوں باقی نہیں ہے۔ کیوں کسی لوک گیت یا کسی داستان میں ان کا تذکرہ نہیں ہے۔ جس طرح سے وہ لوگ گذر گئے۔ اسی طرح تم بھی گذر جاؤ گے۔ افریقہ کے بحرِ ذخار میں تمہاری بساط ایک موج سے زیادہ کچھ نہیں جس سے ایک پل کے لئے طلاطم پیدا ہو۔ اور کنارے پر بیٹھے ہوئے کچھ پرندے پھڑ پھڑانے لگیں، پھر اس کے بعد کچھ نہ رہے۔ کچھ نہ رہے۔ سوائے ایک طویل سناٹے کے"

آپ بہت جذباتی انداز میں سوچ رہے ہیں" موسیو ڈی بلینک نے کہا"

"ہم نے افریقہ کو ایسا جھنجھوڑ کر جگایا ہے کہ اب وہ پھر نہیں سو سکتا۔ ہم نے ان کے لباس ان کے رسم و رواج اور رہن سہن کو بالکل بدل دیا ہے اب ہم یہاں ڈاہلیا پیدا کر کے افریقہ کی روح کو بھی بدل دیں گے"۔

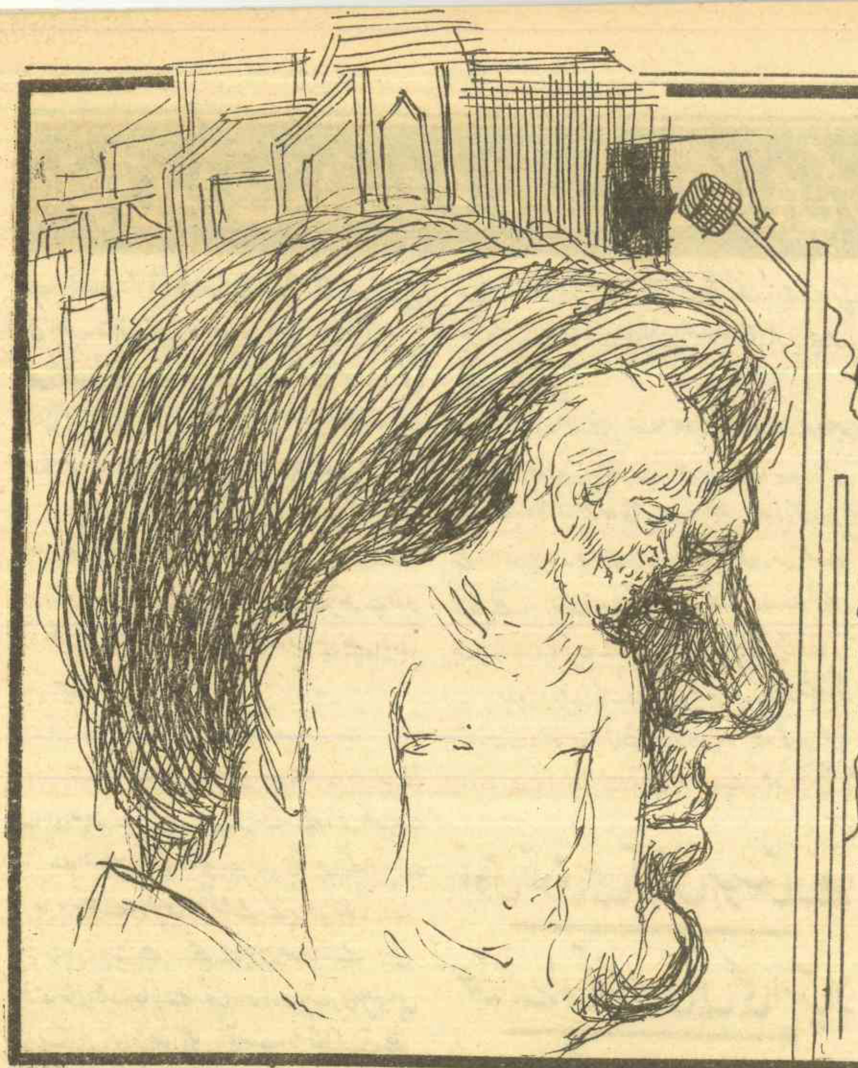
مجھے آپ سے بالکل اتفاق نہیں" برطانوی صحافی نے کہا" کیا آپ اس حقیقت سے انکار کر سکتے ہیں کہ آپ کے بنائے ہوئے پائپ کے نلوں کو اکھاڑ کر آپ پر حملہ کرنے کے ہتھیار بنائے گئے۔ ریلوے لائن کی پٹریاں اکھاڑ کر بھالے بنائے گئے آپ غلط فہمی میں نہ رہیں موسیو... ! جس وقت آپ افریقہ کو چھوڑ کر جائیں گے آپ کے ڈاہلیا کو ڈھور چر جائیں گے۔ آپ کی بنائی سڑکیں پگڈنڈیاں بن جائیں گی۔ اور آپ کے بنائے ہوئے خوبصورت شہر، کھنڈرات میں تبدیل ہو جائیں گے۔ اور افریقی پھر گھنے جنگلوں میں بھاگ جائیں گے"۔

نہیں نہیں اب ایسا نہیں ہو سکتا... موسیو ڈی بلینک نے کہا۔ ہم افریقہ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتے ہم نے افریقہ کو دریافت کیا ہے اور ہم اس دریافت کو ضائع نہیں جانے دیں گے۔ آپ موجودہ سیاسی خلفشار سے بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ ایک وقتی بات ہے۔ یہ تو ایک شر پسند ملک کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ ہے افریقہ ابھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے لائق نہیں ہوا اسے ہمارے سہارے کی ضرورت ہے اور کئی صدیوں تک رہے گی"۔

"جی ہاں۔ جی ہاں۔ برطانوی صحافی نے طنزیہ کہا۔ اس وقت تک جب تک افریقی کانوں میں سونا اور افریقی پاموں میں تیل موجود ہے، افریقہ کسی نہ کسی یورپی ملک کے سہارے کا محتاج رہے گا۔

یہ گفتگو کافی رات تک اسی طرح چلتی رہی۔ جس کے دوران موسیو ڈی بلینک" بار بار کہتے تھے کہ میں ڈاہلیا پیدا کر کے افریقہ کی روح کو بدل دوں گا۔

گمشلا یہ گفتگو سنتا رہا اور اس کے دماغ میں ننھی ننھی سی لہریں اٹھتی رہیں۔ گمشلا گورے لوگوں سے نفرت نہیں کرتا تھا۔ حالانکہ اسے یہ لوگ کچھ عجیب سے معلوم ہوتے تھے۔ ان کی کھال ایسی کچی کچی سی معلوم ہوتی تھی۔ جیسے چھلا ہوا آلو۔ اور اسے کسی گورے آدمی کو چھونے سے کراہت محسوس ہوتی تھی۔ وہ ایسے افریقی نوجوان میں سے تھا۔ جن کو سیاست وغیرہ سے کوئی لگاؤ نہ تھا لیکن اس دن کے بعد سے گمشلا کے انداز میں بڑی تبدیلی آ گئی۔ اس گفتگو نے اس پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ اور اکثر سوچا کرتا تھا کہ اس گفتگو کا مطلب کیا ہے۔ یہ لوگ افریقہ کی روح کو کیوں بدلنا چاہتے ہیں، یہاں ڈاہلیا کیوں اُگانا چاہتے ہیں۔ کیا خوبصورتی کے لئے یہاں کنول گلاب، سورج مکھی اور دوسرے ہزاروں پھول نہیں ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ڈاہلیا ایک پھول ہی نہیں ہے کچھ اور شے بھی ہے کوئی خطرناک اور بہت اہم شے معلوم نہیں کیوں اسے یہ احساس ہونے لگا کہ ڈاہلیا پام کے درختوں کا دشمن ہے وہ پام جو افریقیوں کو لباس خوراک اور سر چھپانے کے لئے چھپر اور نشاط کے لئے شراب مہیا کرتے ہیں۔ اس دن سے گمشلا نے پستہ قد پاموں کے قریب لگے ہوئے ڈاہلیا کے تختوں کی دیکھ بھال بالکل چھوڑ دی اجب وہ اپنے پست قد کے پاموں کی طرف جاتا تو ڈاہلیا کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ گمشلا کو ڈاہلیا کے تختہ سے ایسا



افسانہ

چھوٹے بڑے خانے

زہرا شاہدی

آج گذشتہ تیس برسوں میں پہلی مرتبہ چاندخاں کی بوڑھی مخلص آنکھوں میں لوگوں نے آنسو دیکھے، اور انہیں تعجب ہوا۔ چاندخاں جیسے حوصلہ مند، شیر دل انسان کی آنکھیں بھی رو سکتی ہیں لیکن چاندخاں بھی کیا کرتا کہ جب آنکھیں رونا چاہیں تو دل کی زندی، عقل کی خردمندی اور بازوؤں کی صلابت سب ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔

چاندخاں ہیڈ مستری اپنی ملازمت کے تیس سال پورے کر چکا تھا۔ اسے کارخانے نے ریٹائرمنٹ کا پروانہ دے دیا تھا۔ اور اس کا ذہن آج ان تمام یادوں کو تازہ کر رہا تھا جو اس طویل عرصہ میں وقت کی گرم ہواؤں سے مرجھا گئی تھیں۔ اس نے ان تیس سالوں میں کتنے دکھ سہے تھے۔ کتنے زخم کتنی چوٹیں اپنے دل پر کھائی تھیں۔ لیکن اس نے اپنا عزم عمل اور حوصلہ کار برقرار رکھا تھا۔ اس کے بازوؤں کی فولادی ضرب میں کبھی فرق نہ آیا تھا۔ تپتے ہوئے لوہے کا رُخ پھیر دینے میں اس نے کوتاہی کا الزام اپنے سر نہ لیا تھا۔

چاندخاں کی سوچ دوسرے مزدوروں سے جُدا تھی۔ اس نے زندگی کو طبقاتی تقسیم، فرقِ مراتب اور اقتصادی اور مالی تفاوت کے پیمانوں سے کبھی نہیں ناپا تھا لیکن دو حادثات اس کی روح پر نقش تھے اور ہزار تاویلیں بھی اسے اُن کے جواز کا قائل نہ کر سکی تھی۔

ملازمت کے دوران میں ایک وقت ایسا آیا جب کارخانے کے ڈائرکٹر نے ایک بلیو پرنٹ بنوا کر مشتہر کروایا کہ اس میں ٹیسٹ پنچ مشین کا جو نقشہ ہے اس کے مطابق مشین تیار کرنے والے کو خاطر خواہ انعام دیا جائے گا۔ چاندخاں نے یہ چیلنج قبول کر لیا۔ اس کے ساتھیوں نے دیکھا کہ چھ ماہ تک چاندخاں کو اپنے تن من کا ہوش نہ رہا تھا۔ راتوں کی نیند اس پر حرام تھی۔ فورمین محض کبھی کبھار اس کی نگرانی کے لئے ورکشاپ میں آتا تھا جب چاندخان نے اس مشین کو اسمبل کر کے فورمین کو پیش کیا تو وہ دنگ رہ گیا۔ بورڈ آف ڈائرکٹرز نے معائنہ کے بعد بہت اطمینان اور خوشی کا اظہار کیا اور فورمین کو مبارکباد پیش کی۔

تیسرے روز بورڈ آف ڈائرکٹرز کی طرف سے اس کارنامے کو سراہتے ہوئے، ایک ہزار روپے کا انعام اور تعریفی خط فورمین کے نام اور پانچ سو روپے کا انعام چاندخاں کے نام موصول ہوا۔

چاندخاں کو اس اعلان پر خوشی کم اور حیرت کہیں زیادہ ہوئی اس روز اس کے ذہن میں بڑے باغیانہ خیالات نے جنم لیا۔ آخر فورمین نے مشین کی تیاری میں کیا مدد دی تھی؟ اس میں اس کا کتنا حصہ تھا؟ اس روز پہلی مرتبہ بڑے ڈائرکٹر کو اس نے ایک عرضی لکھوائی۔ جناب عالی! یہ کیا انصاف ہے کہ مجھے شرف ملاقات کا موقع بھی آپ نے مرحمت نہ فرمایا۔ انعام کی رقم بھی کم کر دی۔ اور تعریفی خط بھی عطا نہ کیا۔ جب کہ مشین کی تشکیل کلیتہً میری مشقت اور عرق ریزی کا نتیجہ ہے۔

یہ عرضداشت لے کر جب چاندخاں ہیڈ کلرک کے پاس پہنچا تو وہ اُسے پڑھ کر ہنس دیا۔ چاندخاں نے اُسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو ہیڈ کلرک بولا۔ " بالکل بیکار

خوف محسوس ہوتا تھا جیسے وہاں پاموں کے خلاف، افریقہ کے خلاف اور اس کی روح کے خلاف کوئی خطرناک سازش پروان چڑھ رہی ہے۔

اسی عالم میں دن گذرتے گئے اور آج صبح گمشلا جب اپنے پستہ قد پاموں کے تختے میں گیا تو اس نے دیکھا کہ سیاہ مٹی کے فرش سے ننھی ننھی سبز کونپلیں جھانک رہی ہیں۔ گمشلا بیخودی کے عالم میں ناچنے لگا۔ اسی عالم میں یکایک اس کی نظر ڈاہلیا کے تختے پر پڑی جہاں ایک ایک انچ کے پودے مکھلاتے ہوئے سرنگوں کھڑے ہوئے تھے۔ گمشلا نے قریب جا کر غور سے دیکھا ڈاہلیا کے تمام پودے نزع کے عالم میں تھے اور ان کا وجود کوئی گھڑی کا مہمان معلوم ہوتا تھا۔ گمشلا کو ایسا محسوس ہوا جیسے ڈاہلیا کے سرنگوں پودے سرزمین افریقہ پر پستہ قد پاموں کی آمد کا خیر مقدم کر رہے ہیں۔

سرزمین افریقہ پر پستہ قدموں کی آمد کا خیر مقدم کر رہے ہیں۔ اور اب پام کے سائے میں زمین پر لیٹا ہوا گمشلا سوچ رہا تھا کہ وہ اپنے آقا کو پستہ قد پام کے تجربہ کی کامیابی پر مبارکباد دے یا نہ دے "۔!

اخلاق، مروّت اور دردمندی کو چھوٹے بڑے خانوں میں کس طرح تقسیم کیا جاسکتا ہے

ہے چاند خاں۔ کوئی درخواست بڑے ڈائرکٹر کے پاس پہنچتی ہی نہیں۔ وہ تو اتنے اونچا اتنی بلندی پر بیٹھے ہیں کہ انہیں چھوٹی چھوٹی چیزیں نظر ہی نہیں آتیں، چھوٹی چھوٹی باتیں سنائی ہی نہیں دیتیں۔ ان کا وقت بڑا قیمتی ہے تمہاری آواز اتنی بلندی تک پہنچتے پہنچتے تھک جائے گی۔"

چاند خاں نے فکرمند ہو کر کہا۔ "بڑے بابو آپ اس عرضی پر میری حمایت میں نوٹ لکھ سکتے ہیں۔ مجھے بڑے صاحب سے انعام دلا سکتے ہیں۔ میں ان کی زبان سے شکریے اور تعریف کے دو لفظ سننا چاہتا ہوں۔ ویسا ہی جیسے انہوں نے فورمین کو بلا کر کہے ہیں۔"

بڑے بابو پھر زور سے ہنسے۔ "چاند خاں تم نہیں جانتے میں اپنی طرف سے نوٹنگ نہیں کر سکتا۔ مجھے وہی لکھنا ہے جو میرے افسر کہیں گے اور میرے افسر وہی کہیں گے جو تمہارے بارے میں ہو چکا ہے۔ انہیں ڈائرکٹر کے کئے پر ٹھپہ لگانا ہے۔ یہ بڑی پرانی ریت ہے۔ نیچے سے جو کچھ لکھا جاتا ہے، وہی آخری منزل تک جاتا ہے۔ تمہارے درد کو تمہاری عرضی میں جھانک کر میں ہی پڑھوں گا۔ باقی سب دستخط کرتے چلے جائیں گے حتیٰ کہ بڑے ڈائرکٹر بھی۔"

اور وہی ہوا۔ ایک ہفتہ بعد چاند خاں کو جوابی پروانہ ملا۔ "کمپنی تمہاری کارکردگی اور فنی مہارت کو تسلیم کر چکی ہے لیکن اس مہارت کا بردے کار لانا فورمین کی تجرباتی ذہانت کا نتیجہ ہے اس لئے انہیں تم سے زیادہ انعام کا مستحق سمجھا گیا۔"

اس خط کو سن کر چاند خاں نے پہلی مرتبہ اپنے شکستہ دل کی آواز سنی اور سہہ گیا کہ یہی اس کی عادت تھی۔

دوسرا حادثہ جس نے اس کی روح پر زخم لگائے، چاند خاں کے ساتھی فیروز خاں کی حسرت ناک موت تھی۔ ایسی دردناک موت کہ کارخانے کا ماحول بین کرنے لگا تھا۔ اور سارا عملہ سسکیاں بھر رہا تھا۔ فیروز خاں کا توانا اور کڑیل جسم اچانک قوی ہیکل مشین کی لپیٹ میں آکر پاش پاش ہو گیا۔ بعد میں اس کے جنازے میں کارخانے کے کل مزدوروں نے شرکت کی تھی۔ ایڈمن افسر کارخانے کی نمائندگی کر رہے تھے کارخانے کی کتنی کلوں اور پرزوں میں فیروز خاں کی روح کارکردگی نفوذ کر گئی تھی، یہ صرف چاند خاں ہی جانتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ فیروز خاں کی موت پر ایک تعزیتی جلسہ ہو۔ جس میں بڑے ڈائرکٹر بھی آئیں وہ مرحوم کی خدمت کو سراہیں، ان کا سر سوگ کے عالم میں جھک جائے اور وہ معاوضے کی رقم کا چیک اپنے ہاتھوں سے فیروز خاں کی بیوہ کی طرف بڑھائیں اور وہ لاچار عورت احساس ممنونیت اور تشکر سے بلک کر رو پڑے۔ کہ یہی عقیدت و احترام کے پھول ہیں جو مرحوم کی یاد پر نچھاور کئے جا سکتے ہیں۔

چاند خاں نے یہ سب مناظر کارخانے کے ورکس منیجر کی اچانک موت پر دیکھے تھے۔ کارخانے کے افسروں میں اس موت پر تہلکہ سا مچ گیا تھا۔ اس روز کام بند ہو گیا تھا اور بڑا ہنگامہ خیز تعزیتی جلسہ ہوا تھا۔ بڑے صاحب آنکھوں میں آنسو بھر لائے تھے۔ اور ان کی قیادت میں افسروں کا ایک وفد سیاہ لمبی کار میں ایک بڑی رقم کا چیک لے کر ورکس منیجر کی بیوہ کی کوٹھی پر گیا تھا۔

اور جب فیروز خان کی موت پر یہ سب نہ ہو سکا۔ تو چاند خان کے وجود میں کوئی شے اندر ہی اندر سلگنے لگی۔ یہ کیسا تفاوت ہے؟ آدمی آدمی میں تو فرق ہو سکتا ہے، عہدہ اور تنخواہوں

آدمی آدمی میں تو فرق ہو سکتا ہے، عہدے اور تنخواہوں میں بھی امتیاز ممکن ہے، لیکن ایک انسان اور دوسرے انسان کی موت اپنی اصل میں جداگانہ کیوں ہے؟

میں بھی امتیاز ممکن ہے، لیکن ایک انسان اور دوسرے انسان کی موت اپنی اصل میں جداگانہ کیوں ہے، اخلاق، مروت اور دردمندی کو چھوٹے بڑے خانوں میں کیسے تقسیم کیا جا سکتا ہے نیکی اور بھلائی فلاح اور رفاہ کے جذبوں میں اعلیٰ و ادنیٰ کی چھاپ کیسے لگائی جا رہی ہے۔

اسی روز سے چاند خان کے دل میں بڑے ڈائرکٹر سے ایک بار ملنے کی تمنا کروٹیں لینے لگی جب وہ اپنے دل کا یہ دکھ بڑے ادب سے ان کے سامنے بے نقاب کر دے گا۔ لیکن اسے یہ موقع نصیب نہ ہوا۔ حتیٰ کہ اس کا ریٹائرمنٹ کا دن آ پہنچا۔

آج چاند خان کی الوداعی پارٹی تھی۔ اس سے ایڈمن افسر نے کہا تھا کہ بڑے صاحب اس کی الوداعی پارٹی میں شرکت کریں گے۔ انتہائے مسرت اور ایک انجانے احساس عظمت اور عقیدت سے اس کی رگ و پے میں کپکپی سی طاری تھی۔ وہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈائس پر عجیب خوابناک کیفیت میں بیٹھا تھا۔ سامنے سینکڑوں مزدور اسے عقیدت فخر کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ بڑے ڈائرکٹر کی آمد کا انتظار تھا۔ اور چاند خان بڑے جانفزا خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ وہ لمحہ جب بڑے صاحب کو وہ دیکھے گا۔ پہلی مرتبہ ان کے لبوں کی پروقار مسکراہٹ اس کا خیر مقدم کرے گی وہ اس سے مصافحہ کریں گے۔ اس کے اتنے قریب ہوں گے کہ وہ فخر سے پھولا نہ سمائے گا۔ اور جب وہ اس کے گلے میں الوداعی گجرے پہنائیں گے۔ تو تالیوں کا سہانا شور گونجے گا اور اس کی تیس سالہ جان سوزی اور جگر کاوی کا انعام اسے مل چکا ہو گا۔ پھر وہ بردباری سے مائیک پر آ کر الوداعی تقریر میں وہ سب کچھ کہہ دے گا۔ جو اس کے دل میں ہے۔ اخلاق، انصاف رحم و مروّت کی خانہ بندی مشقت و محنت کی تفریق

اور وہ اس حیات بخش خواب سے اس وقت چونکا جب ایڈمن افسر مائیک پر کھڑا اعلان کر رہا تھا۔ "مجھے یہ اعلان کرتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ منیجنگ ڈائرکٹر نے ابھی ابھی مجھے فون پر معذرت کی ہے کہ وہ اس جلسہ میں شرکت نہ کر سکیں گے اس لئے کہ آج ہی شام کو ڈپٹی ڈائرکٹر صاحب کے یہاں شادی کی سالگرہ میں شرکت کی اچانک دعوت ملی ہے۔

چاند خاں نے جب یہ سنا تو اسے یوں لگا جیسے اس کے روبرو بجلی کے کئی قمقمے پھٹ گئے ہوں اور اس کا وجود اس آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں آگیا ہو۔

اس کے بعد اسے نہیں معلوم کہ کب اسے ہار پہنایا گیا۔ کب ایڈمن افسر نے الوداعی تقریر کی اور کب اسے مائیک کے سامنے جوابی تقریر کے لئے کھڑا کر دیا گیا۔ بس ایک بت تھا جس نے سب کچھ دیکھا۔ ایک لاش تھی جس کے ساتھ سب کچھ ہو رہا تھا

البتہ جب اس نے اپنے آپ کو مائیک کے سامنے پایا تو اس کی اداس بوجھل نگاہیں سینکڑوں مزدوروں کے سامنے ایک بار اٹھیں اور پھر چھلک پڑیں۔ آنسو بھری دار کٹوروں سے ٹپ ٹپ ٹپاٹپ ڈائس پر گرنے لگے۔ جیسے انصاف، رواداری، مروت حق شناسی کے چھوٹے بڑے خانے اس کے پیروں میں پڑے ہوئے آنسوؤں سے بھرے جا رہے ہوں

چاند خان نے اپنے آنسو پینے کی بہت کوشش کی مگر جب آنکھیں رونا چاہیں تو دل کی دردمندی، عقل کی خردمندی اور بازوؤں کی صلابت سب ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔

مشرقی بنگال میں بائیں بازو کی تحریک —— آخری قسط

عبدالحمید
خاں

مجیب کی قوم پرست تحریک کی مخالفت مارکسسٹوں کے لئے تباہ کن ہوگی

ایک خود مختار مشرقی بنگال کے مسائل کا حل ثقافتی انقلاب سے بھی ممکن ہوگا

مشرقی بنگال میں انقلاب کی کامیابی کے لئے زبردست طبقاتی منافرت سے قطع نظر کچھ اور محرک قوت بھی درکار ہے۔ یہ طاقت اسی طرح پیدا کی جا سکتی ہے کہ نیشنلزم یا قومیت پرستی کے اصول کو طبقاتی جنگ کے ساتھ ملا دیا جائے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ چین اور ویت نام دونوں جگہوں پر مارکسسٹوں نے جو اپنی جتھہ بندی کی طویل مسلح لڑائیاں لڑیں اور بالآخر کامیابی حاصل کی تو اس کامیابی کا ایک اہم اور مضبوط عنصر ان کا مطالبۂ حقِ خود اختیاری تھا۔ مشرقی بنگال میں بائیں بازو کے مارکسسٹوں نے ۱۹۶۰ء کے بعد کے برسوں میں اس موقع کو ہاتھوں سے گنوا دیا اور قومی تحریک کو اپنی راہ پر چھوڑ دیا کہ جو رخ چاہے، اختیار کرلے۔ بائیں بازو کے مارکسسٹ اگرچہ آج کل نیشنلزم کی مخالفت میں اس طرح مبتلا نظر نہیں آتے، جس طرح ابھی کچھ عرصہ پہلے مبتلا تھے، تاہم قوم پرستی کی ایک مضبوط اور یکسر آزاد تحریک جو طبقاتی امتیازات کی حدوں سے بھی تجاوز کر کے عوام میں پھیل گئی ہے، بجائے خود اس حقیقت کا پتہ دیتی ہے کہ کسی "بائیں بازو کی قوم پرست تحریک" کے لئے جو اس کے متوازی چلائی جا سکے، فی الحال کوئی گنجائش نہیں ہے۔

نیشنلزم کی مخالفت کا انجام، تباہی؟

یہ موقف اختیار کرنا کہ سماجی تبدیلیوں کے موجودہ دور میں تاریخی اعتبار سے نیشنلزم کا دھارا کوئی معنی نہیں رکھتا، دراصل اس کی مخالفت کے مترادف ہے۔ بائیں بازو کے مارکسسٹوں نے یہ کہنا شروع کیا ہے کہ مجیب کی قیادت میں قوم پرستی کا موجودہ اُبال ضرور ناکام ہوگا۔ عملاً اس روش کے معنی ایک بار پھر قوم پرستی کی مخالفت ہوں گے۔ صرف وہی مارکسسٹ جو سیاسی طور پر بالکل اندھا ہو، اس حقیقت سے انکار کرے گا کہ قوم پرستی کا اصل دھارا اس تحریک کے ذریعے آگے بڑھا ہے، جس کی قیادت عوامی لیگ کے ہاتھ میں ہے، نہ کہ اس تحریک کے ذریعے جو "عوامی جمہوریہ مشرقی بنگال" کی خود مختاری چاہتی ہے۔

نیشنلزم کے بڑھتے ہوئے پُر جوش دھارے کی مخالفت کرنا گویا دیو ہیکل طوفانی لہروں کی راہ میں کھڑے ہونا اور ظاہر ہے کہ یہ لہر روندتی، کچلتی اور ہلاک کرتی ہوئی آگے جا چکی ہوگی۔ ماضی میں بائیں بازو کے لوگوں سے جو غلطی ہوئی ہے اور جس کے نتیجہ میں قوم پرستی کی تحریک تمام تر غیر مارکسسٹ عناصر کے ہاتھوں میں منتقل ہوگئی تو اب اس غلطی کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ اس مرحلے پر قیادت کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کرنا اور اس کے لئے نئی جمہوریت کی انقلابی جدوجہد کے نعرے کو انتہا درجے کی خود مختاری کے نعرے سے ہم آہنگ کرنا، ایک دوسری غلطی ہے، کیونکہ قوم پرستی کے بہتے ہوئے تیز دھارے کا رخ موڑنے کی کوشش محض بیکار ہوگی۔

معقول حکمت عملی ایک یہی رہ گئی ہے کہ موجودہ قومی تحریک کو اپنا عمل پورا کر لینے دیا جائے۔ قومیت کی موجودہ جدوجہد اگر

ممکن ہے کہ مشرقی بنگال سوشلسٹ ارتقاء کے باب میں ایک اور طرح کا نمونہ ثابت ہو بہر حال، یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ سوشلزم کے مطابق تبدیلیوں کا عمل کسی بھی دو ملک میں یکساں نہیں ہوتا

کامیاب ہو جاتی ہے تو مارکسسٹ اپنے آپ کو ایک بالکل بدلی ہوئی اور نئی صورت حال میں پائیں گے۔ ایک مکمل خود مختار مشرقی بنگال میں یہ امکان نہیں کہ اس میں سرمایہ دار اور دوسرے استحصالی طبقے مضبوط اور منظم طور پر موجود ہوں۔ اس وقت یہ ممکن ہے کہ اقتدار کا تختہ الٹنے کے لئے ایک طویل اور مسلح جدوجہد کا سوال ہی باقی نہ رہے، کیونکہ یہ امکان نہیں کہ حکومت مُردم خود سرمایہ دارانہ نظام کی اتنی سختی سے پابند ہو کہ اپنے آپ کو بچانے کے لئے خونریز کارروائی پر اُتر آئے۔ اُس وقت ممکن ہے، محض اس قدر ضروری ہو کہ ایک ثقافتی انقلاب برپا کیا جائے، تاکہ عوام کی بھاری اکثریت کو یہ باور کرایا جا سکے کہ ایک سچے سوشلسٹ نظام کے قیام میں کتنے بہت سارے فائدے پوشیدہ ہیں۔

ایک کلیتاً خود مختار مشرقی بنگال میں ریاستی اقتدار کے لئے فوجی اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے اتنے کٹر سوشلسٹ دشمن ہونے کا امکان نہیں کہ ثقافتی انقلاب کے اجراء سے بھی پہلے اس کا یہ جبر تختہ الٹنے کی ضرورت درپیش ہو۔ بہر حال یہ سب قیاس آرائی ہے اور تاریخ کے واقعات جس طرح رو بہ عمل آتے ہیں، اُن سے ان قیاس آرائیوں کی بہ آسانی تردید ہو سکتی ہے۔ لیکن اس ملک میں مارکسسٹوں کو ایک بار تو اپنی اس آمادگی کا اظہار کرنا پڑے گا کہ وہ جدت اور تغیر کی طرف مائل ہیں، ممکن ہے کہ مشرقی بنگال سوشلسٹ ارتقاء کے باب میں ایک اور طرح کا نمونہ ثابت ہو۔ بہر حال یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ سوشلزم کے مطابق تبدیلیوں کا عمل کسی بھی دو ملک میں یکساں نہیں ہوتا۔

تاہم اگر موجودہ قوم پرستی کا اُبال ناکام ہو جاتا ہے۔ خواہ اس کا سبب یہ ہو کہ اس کے رہنما پارلیمانی تجربے کی ناکامی کی صورت میں پارلیمانی سے باہر جدوجہد کو آگے بڑھانے کے اہل ثابت نہ ہوں یا اس کی وجہ موجودہ قیادت کی سمجھوتے بازی ہو، بہر حال دونوں صورتوں میں عوام بائیں بازو کے مارکسسٹوں کے طریق کار کو ناگزیر سمجھنے پر مجبور ہو جائیں گے اور اُس وقت پُر جوش اور ولولہ انگیز نیشنلزم کی طاقت انہی مارکسسٹوں کے شریک حال ہوگی۔



جستہ جستہ

پادری صاحب پٹرول پمپ پر

ایک پادری ہیں لڈ لوکریم۔ سالانہ تنخواہ انکی ۱۳ ہزار ۶ سو ڈالر ہے جو خاصی معقول رقم ہے لیکن ایک بار دوسرے پادریوں کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ کریمر صاحب، فالتو وقت میں ایک پٹرول پمپ پر بھی نوکری دیتے ہیں۔ اس دوسری ملازمت کی وضاحت انہوں نے اس طرح کی کہ میں نے نو ہزار ڈالر اپنی انتخابی مہم کے لئے قرض لئے۔ وہ سیٹل میں میئر کا الکشن لڑ رہے تھے لیکن ان کا حریف مضبوط آدمی تھا، مقامی سیاست دانوں اور صنعتکاروں کی اسے حمایت حاصل تھی، اس لئے پادری کریمر صاحب ہار گئے البتہ انہیں یہ ضرور معلوم ہو گیا کہ امریکہ کے "مسیحی اور خدا پرست" معاشرے میں، جب الکشن کا وقت آتا ہے تو "سکہ" سرمایہ دار کا ہی چلتا ہے اور اس معاشرے میں "سب کے لئے مساوی مواقع" کا مطلب یقیناً یہ نہیں ہوتا کہ پادری جیت جائے اور سرمایہ داروں کا امیدوار ہار جائے"!

روٹی تو کسی طور

امریکہ میں جوہری سائنس کے ماہر این ہبرڈ، وہ صاحب ہیں، جنھوں نے خلائی جہاز اپالو کے لئے خلا میں ریڈیائی لہروں کی پیمائش کے آلات تیار کئے تھے این ہبرڈ صاحب ان دنوں کیلیفورنیا کے ایک ریستوران میں کاک ٹیل تیار کرتے ہیں۔ جی نہیں، یہ محض دلبستگی یا تفریح کے لئے نہیں یہ ان کی نئی ملازمت ہے۔ یونائیٹڈ پریس انٹرنیشنل کی اطلاع ہے کہ ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۰ء کے اواخر تک تقریباً دس ہزار سائنسدان، اعلیٰ تعلیم یافتہ انجینئر اور ٹیکنیشن بے روزگار ہو چکے ہیں، کیونکہ حکومت نے خلائی تحقیق کے لئے اپنی منظور کردہ رقم میں کمی کر دی ہے۔ اس طرح بے روزگار ہونے والوں میں کچھ انجینئر، لان میں گھاس کاٹتے ہیں، کچھ ٹیکنیشن کاریں دھوتے ہیں اور فزکس پر ہبرڈ صاحب کی بصیرت، پیمانے میں شراب گھولنے کے کام آ رہی ہے۔

بنام جہاندار جان آفریں

فونکس (امریکہ) کی ایک خاتون مسز بی جی ہنٹرس نے گزشتہ سال اکتوبر میں نقصانات کی تلافی کے لئے ایک مقدمہ اللہ تعالیٰ کے خلاف مقامی عدالت میں ٹھونک دیا۔ اس سے پہلے حادثہ یہ گزرا کہ بجلی گری اور ان کا مکان جل گیا۔ جج مسٹر رسل ای ٹینسی نے مقدمہ کی سماعت کی اور فیصلہ مسز بی جی ہنٹرس کے حق میں دیا۔ چنانچہ ایک لاکھ ڈالر ہرجانے کی ڈگری جاری کر دی گئی اخبار کے رپورٹر اس فیصلے پر بہت حیران ہوئے، جج صاحب سے پوچھا، یہ تو بتائیے کہ عدالت کے پیادے ہرجانہ کس طرح وصول کریں گے؟

جج نے جواب دیا۔ اس میں کیا مشکل ہے، ہم مقامی چرچ والوں سے کہیں گے جرمانے کی رقم تم بھرو، آخر زمین پر "اللہ تعالیٰ کے نائب ہو" اور اس کے نام پر رقم اکٹھا کرتے ہو، اب خرچ بھی تو کرو۔"



مرتے مرتے عیش کر گئے

جنوبی افریقہ کے نسل پرست حکام نے اس امر کی تاکید کر دی ہے کہ سفید فام اور افریقی مجرموں کو ایک ہی سولی پر نہ لٹکایا جائے۔ اب دونوں طرح کے مجرموں کے لئے سفید اور سیاہ پھانسی کے پھندے تیار کئے گئے ہیں۔

سکّے کی قیمت میں کمی کے ڈر سے

پیرس، لندن اور نیویارک میں بیش قیمت تصاویر اور نوادرات کی مانگ اچانک بہت بڑھ گئی ہے، اس کے ساتھ ہی ان کی قیمتوں میں بھی تقریباً ۲۵ فیصد اضافہ ہو گیا ہے۔ نامور مصور پکاسو کی تصاویر کے پورٹریٹ خاص طور پر مہنگے ہوئے ہیں۔ پندرہ سال پہلے کے مقابلے میں ان کی قیمتیں دس گنا بڑھ گئی ہیں۔

ماہرین کے خیال میں نوادر کی اس بے تحاشہ طلب اور گرانی میں آرٹ کی قدر افزائی سے زیادہ سرمایہ داری کی تجوری کے مطالبے کام کر رہے ہیں۔ دراصل بازار میں کرنسی کا اعتبار نہیں رہا۔ معلوم نہیں کب سکّے کی قیمت کم ہو جائے، اور بیٹھے بٹھائے لاکھوں کا نقصان ہو جائے۔ لیکن نوادر کے عاشق اور خاص طور پر پکاسو کے "قدردان" نادر اشیا اور تصاویر خرید کر اس لئے رکھ لیتے ہیں کہ ان کی قیمت میں کمی کا ڈر نہیں ہوتا۔ گھر میں پڑی ہوئی تصویر، بینک میں پڑے ہوئے نوٹ سے زیادہ "محفوظ" ہوتی ہے۔

شادی کی انشورنس

سویڈن کی ایک انشورنس کمپنی نئے شادی شدہ جوڑوں کو طلاق کے خلاف خوشگوار عائلی زندگی کی ضمانت دیتی ہے۔ دولہا دلہن اگر انشورنس پالیسی خرید لیں تو پہلے سال انہیں ۵۰ کراؤن پالیسی کی پہلی قسط کے طور پر دینا پڑے گا۔ یہ رقم رفتہ رفتہ بڑھتی جائے گی۔ یہاں تک کہ شادی کے ساتویں سال میں ۳۵۰ کراؤن تک پہنچ جائے گی، اس کے بعد رقم کم ہوتی جائے گی بارہویں۔ پندرہویں اور سترہویں سال میں پہنچ کر پالیسی کی رقم پھر بڑھ جائے گی کیونکہ کمپنی کی رائے میں یہ سال، شادی شدہ جوڑوں کے لئے "نہایت خطرناک" ہوتے ہیں۔ طلاق کی صورت میں کمپنی انشورنس کی رقم اور عدالتی چارہ جوئی کے سارے مصارف ادا کرتی ہے۔

ضرورت ہے

کوپن ہیگن میں بجلی کے آلات کی ایک فرم نے ہفتے کے اخبار میں چوکیدار کی ملازمت کے لئے اشتہار شائع کرایا۔ اتوار کا ناغہ تھا۔ پیر کو دکان صاف تھی۔ چوکیدار کی آمد سے پہلے ہی، کوئی چور اشتہار کا مضمون دیکھ کر اپنا کام کر چکا تھا۔

خاموش رہو

امریکہ کی ایک ریکارڈ کمپنی نے ۵ ڈالر فی ریکارڈ کے حساب سے دس ہزار ریکارڈ فروخت کے لئے تیار کئے ہیں۔ اس میں یقیناً شہرۂ آفاق موسیقار یا مغنیہ کی آواز محفوظ ہو گی لیکن جی نہیں، آپ کا خیال غلط ہے۔ ۵ منٹ کے ایک ریکارڈ میں ساڑھے چار منٹ تک کوئی آواز سنائی نہیں دیتی، سوائے اس کے کہ ریکارڈ کے اوپر گراموفون کے گھسنے کی آواز آتی رہتی ہے جب آدھا منٹ رہ جاتا ہے۔ تو واہ وا اور شاباش کی مختصر آواز سنائی دیتی ہے اور یوں ریکارڈ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کا مقصد خاموشی کی اہمیت کو ذہن نشین کرانا ہے۔

کمپیوٹر کی برطرفی

ایک برطانوی کمپنی کے چار ہزار ملازموں نے جعل سازی اور فریب دہی کے الزام میں کمپنی کے کمپیوٹر کی "فوری برطرفی" کا مطالبہ کیا ہے، بصورتِ دیگر ملازمت سے مستعفی ہو جانے کی دھمکی دی ہے۔ یہ "برقی کلرک" ان کے واجبات اور انکم ٹیکس کا حساب لگانے میں ہمیشہ غلطی کرتا رہا ہے۔ اور اس غلطی کا فائدہ کمپنی کو اور نقصان ملازموں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔

نیپ کی وزارت کا رہا سہا امکان بھی ختم ہو گیا

آئینی مفاہمت پر ولی خاں کے بیان سے اسلم خٹک روٹھ گئے

ملک میں تیزی سے بدلتے ہوئے حالات نے ایسی غیر یقینی فضا پیدا کر دی ہے کہ آئندہ واقعات کے متعلق کسی قسم کی قیاس آرائی ممکن نہیں رہی سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والوں کے لئے یہ سیاسی بحران غیر متوقع نہیں لیکن جس مرحلے پر ہمیں اس سے دوچار ہونا پڑا اس کا کسی کو تصور بھی نہیں تھا۔ عام خیال یہ تھا کہ بعض عناصر کی ضد اور ہٹ دھرمی کا یہی عالم رہا تو شاید نیشنل اسمبلی کے پہلے اجلاس میں ہی ان کے درمیان تصادم ہو جائے اور ملک آئینی بحران کا شکار ہو جائے، لیکن یہ بحران پہلے ہی واقع ہو گیا اور افسوسناک امر یہ ہے کہ ان لوگوں کے غیر دانشمندانہ رویہ سے پیدا ہوا جو ملک کی اکثریتی پارٹیوں کے رہنما ہیں جو عوام کی کشتی کے ناخدا ہیں جنہیں سامراجی اور رجعتی عناصر کی ان سازشوں کا بخوبی علم تھا کہ وہ یہاں آئینی بحران پیدا کر کے مارشل لاء نافذ رکھنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں یہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے وہ ان مکروہ سازشوں کا شکار ہو گئے یعنی جو کام دشمن نہ کر سکے وہ خود ان کے ہاتھوں انجام پانے کو ہے۔

عوام نے جمہوریت کی بحالی اور ایک عادلانہ نظام کے حق میں رائے دے کر ملک کے دونوں حصوں کی اکثریتی پارٹیوں کے رہنماؤں کو یہ موقع فراہم کیا کہ اس نظام کو استوار کر کے ایک خوشگوار مستقبل کی داغ بیل ڈالیں۔ لیکن یہ رہنما اپنے ذاتی وقار کا سوال بنا کر اپنے فرض کی بجا آوری میں ناکام ثابت ہو رہے ہیں۔ جو ایک افسوسناک امر ہے اور سب سے زیادہ تشویشناک بات یہ ہے کہ پورے ۲۳ برس تک لٹنے اور پامال ہونے والے پاکستانی عوام ان انتخابات میں عوامی نمائندوں کو کامیاب بنا کر جو خوشگوار امیدیں ان سے وابستہ کئے ہیں اور انہیں اپنا آخری سہارا سمجھے ہیں ان کا اعتماد موجودہ صورتحال سے بری طرح مجروح ہو رہا ہے اور اگر جلد از جلد اس کا کوئی حل تلاش نہ کیا گیا اور یہ بحران ختم کرنے کی کوشش نہ کی۔ تو یہ شکستہ دل مجبور و محروم عوام یہ آخری موقع کھو دینے کے بعد ایسی مایوسی اور بے اعتمادی کا شکار ہو جائیں گے کہ آئندہ کے لئے کسی آئینی جدوجہد پر سے ان کا یقین اٹھ جائے گا۔ اس صورت میں یہاں بھی وہی کچھ ہو گا جو عام طور پر ایسے حالات کا نتیجہ ہوتا ہے یعنی ملک کو ایک ایسے خونیں انقلاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

نیشنل عوامی پارٹی کے لیڈر ولی خاں نے قومی اسمبلی کے اجلاس میں اپنی شمولیت کا جواز پیش کرتے ہوئے اس توقع کا اظہار کیا ہے کہ چھ نکاتی پروگرام درحقیقت عوامی لیگ کا ایک سیاسی نعرہ ہے۔ عوامی لیگی رہنما آئین چھ نکاتی پروگرام کی بنیاد پر ضرور بنائیں گے۔ لیکن آئین کی بنیاد اور پارٹی کے چھ نکاتی پروگرام میں فرق ہو گا۔ ولی خان نے کہا کہ وہ مضبوط مرکز کے حامی ہیں اور کرنسی دفاع اور امور خارجہ کو مرکز کے تحت رکھنے کے حق میں ہیں انہوں نے عوامی لیگ کے چھ نکات میں سے دو نکات سے اپنے سابقہ بیان کے مطابق اختلاف کا اظہار بھی کیا لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ آئین کی تیاری میں عوامی لیگ کے چھ نکات میں لچک پیدا ہونے کی جو توقعات وہ لگائے بیٹھے ہیں اگر وہ پوری نہ ہوئیں تو کیا رویہ اختیار کریں گے۔

نیپ کے حامی، پیپلز پارٹی میں چلے گئے

ولی خاں کے نیشنل اسمبلی میں شریک ہونے کے فیصلے پر خود ان کی پارٹی کے بعض ارکان نکتہ چینی کر رہے ہیں صوبائی اسمبلی کے آزاد ممبر اسلم خٹک جنہیں کامیاب بنانے کے لئے ولی پارٹی نے اپنا امیدوار بٹھا دیا تھا اور جنہیں ولی خاں صوبائی وزارت میں وزیر اعلیٰ بنانے کا منصوبہ بنا رہے تھے، ان کے حالیہ بیان سے مایوس ہو کر پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے ہیں اور ان کی پارٹی کے بعض دوسرے ممبروں میں وزیر اعلیٰ بنانے کا منصوبہ بنا رہے تھے، ان کے حالیہ بیان سے مایوس ہو کر پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے ہیں اور ان کی پارٹی کے بعض دوسرے صوبائی ممبروں کے بھی پیپلز پارٹی میں آنے کی افواہیں گرم ہیں اس طرح اب صوبہ سرحد میں نیپ وزارت بننے کے رہے سہے امکانات بھی ختم ہو گئے ہیں۔

بہرحال آئندہ دو ہفتے پاکستان کی ملکی سیاست میں بڑے اہم ہیں۔ اس وقت سارے ملک کی نظریں عوامی لیگ کے سربراہ شیخ مجیب الرحمٰن پر لگی ہیں کہ نئے حالات میں آئینی بحران کا حل تلاش کرنے کے لئے کیا اقدام کرتے ہیں۔ پیپلز پارٹی نے خواتین کی نشستوں کے انتخاب اور سپیکر کے چناؤ میں حصہ لینے سے دستبرداری کا اعلان کر کے شیخ مجیب الرحمٰن کے لئے جو مشکل پیدا کر دی ہے اس کے پیش نظر اگر وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہو گئے تو پھر بعید نہیں کہ اگرچہ یہ ایک موہوم سی امید ہے تاہم اس مایوسی کی تیرہ و تار فضا میں صرف یہی ایک امید کی کرن ہے۔

کچھ عرصہ سے صوبہ سرحد کے تعلیمی اداروں کا بحران تشویشناک صورت اختیار کر رہا ہے اس کی وجوہ کیا ہیں، ان پر غور کرنا اور ان کا کھوج لگانا حکومت کا کام ہے۔ اتنی بات واضح ہے کہ نظم و نسق کی خرابی انتظامیہ کی بے توجہی اور غلط طریق کار بہت حد تک حالات کو بگاڑنے کے ذمہ دار ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سکریٹری محکمہ تعلیم، ڈائرکٹر محکمہ تعلیم، یونیورسٹی کے وائس چانسلر کالجوں کے پرنسپل اور اساتذہ کے درمیان کسی قسم کا کوئی ربط و نظم اور تعاون قائم نہیں رہا اور بغیر کسی کے مشورے کے سب اپنی اپنی راہ پر گامزن ہیں اس کے باعث بعض اعلیٰ افسروں کی خودسری اور سخت گیری بھی ہے۔ اور دوسرے عملے کی نااہلیت اور مصلحت ناشناسی بھی۔ نتیجہ یہ کہ اس وقت صوبے کے طول و عرض میں بیشتر کالج بند ہیں۔ یونیورسٹی میں ہڑتالوں کا زور ہے اور طلبا میں ایسا اضطراب پایا جاتا ہے کہ آئندہ چند دنوں میں اگر حالات پر قابو نہ پایا گیا تو پشاور یونیورسٹی کے غیر معینہ عرصے کے لئے بند ہو جانے کا خدشہ ہے۔ ایک طرف انجنیئرنگ کالج نے اپنے مطالبات منوانے کے لئے ۵ مارچ سے ہڑتال کرنے کا نوٹس دیدیا ہے دوسری طرف کامرس کالج کے طلبا ہڑتال کی دھمکی دے رہے ہیں۔ ادھر خیبر میڈیکل کالج کا قضیہ اپنی جگہ اسی طرح قائم ہے۔ کالج کی یونین نے سکریٹری تعلیمات کی اس یاددہانی پر کہ ایک ہفتہ کے اندر وہ پرنسپل کی برطرفی کا مطالبہ پورا کر دیں گے۔ ۱۸ فروری سے کلاسوں میں جانے کا فیصلہ کیا ہے لیکن ساتھ یہ نوٹس بھی دیدیا ہے کہ اگر ۲۰ فروری تک ان کا یہ مطالبہ پورا نہ کیا گیا تو انتہائی قدم اٹھائیں گے، یونین نے یہ فیصلہ جنرل باڈی کے اجلاس میں کیا اس اجلاس میں انجنیئرنگ کالج، ایگریکلچرل کالج، اسلامیہ کالج، لاء کالج، کامرس کالج، شعبہ انگریزی، شعبہ کیمسٹری، شعبہ پولٹیکل سائینس شعبہ عربی اور کالج آف ایجوکیشن کے طلبا کی یونینوں کے صدر خاص طور پر شامل ہوئے۔ انہوں نے خیبر میڈیکل کالج کی یونین کو یقین دلایا کہ مقررہ تاریخ تک ان کا مطالبہ پورا نہ ہونے کی صورت میں پوری یونیورسٹی کے طلبا ان کا ساتھ دیں گے اور ان کی جدوجہد میں ان کے دوش بدوش حصہ لیں گے۔

چھوٹی صنعتوں کیلئے بڑی مشکلات

مغربی پاکستان کی چھوٹی صنعتوں کی کارپوریشن نے حکومت کو تجویز پیش کی ہے کہ چھوٹے سرمایہ کاروں کو زرمبادلہ کی مشکلات سے نجات دلانے کے لئے ایک کنسورٹیم قائم کیا جائے جس کی سفارشات پر انہیں زرمبادلہ کی مشکلات سے نجات مل سکے، کارپوریشن کے ممبر کرنل کرامت اللہ نے ایک پریس کانفرنس میں بتایا کہ یہ کنسورٹیم جو مختلف بینکوں کے اشتراک سے بنے گا کارپوریشن کے منصوبوں کو بڑھانے میں معاون ثابت ہو گا۔



اسلامی نظام کا معمہ

مصنف و مترجم :- سید احمد بی اے ایل ایل بی علیگ

(اصل کتاب انگریزی زبان میں)

ملنے کا پتہ :- اے ۵۵۶ - رائل روڈ - پرانا سکھر

صفحات :- ۱۲۸ - قیمت :- چار روپے

اس کتاب کے مصنف نے اسلامی نظام حیات کا تعین کرتے ہوئے پہلے تو یہ بات واضح کر دی ہے کہ خلافت راشدہ شخصیتوں کا مجموعہ تھی" جس کی آب و تاب اِن شخصیتوں کے ساتھ رخصت ہو گئی . . . . اگر اصولاً یہ بات مان لی جائے کہ سیاسی مسائل میں خلفائے راشدین کا طرز عمل نہ حجت ہے اور نہ قانونی نظیر تو بہت سی غیر ضروری سختیاں، اسلامی قانون سے دُور ہو جائیں گی اور قوم کورانہ تقلید کی جگہ عقل کی راہ پر گامزن ہو جائے گی۔

سوال یہ ہے کہ پھر اسلامی آئین، اسلامی قوانین اسلامی نظام معیشت اور اس میں سود اور زکوٰۃ وغیرہ کے امور کس بنیاد پر طے ہوں گے۔ یعنی یہ کیونکر طے ہو کہ "اسلامی" کیا ہے، اور "غیر اسلامی" کیا، مُراد یہ کہ اسلامی نظام مولانا مودودی کا درست ہے یا مولانا بھاشانی کا، جو ایک بالکل مختلف نظریۂ حیات پیش کرتے ہیں۔ سوشلزم سے مذہب کو کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتے، حتیٰ کہ سوشلزم کو مذہب کی رُوح کے عین مطابق خیال فرماتے ہیں۔ فاضل مصنف نے علماء کے مختلف اور متضاد نقطہ ہائے نظر کے درمیان حق کی راہ یوں نکالی ہے کہ جو کچھ قرآن و سنت کی روشنی میں درست ہو، وہی درست ہے، لیکن اوقات قرآن و سُنّت کے احکام صریح نہیں ہوتے۔ تو اسکی نظیر تاریخ سے مِل جاتی ہے اور شواہد سے اسکی صداقت ثابت ہوتی ہے، بس اسی کو "اسلامی" خیال کرنا چاہیئے۔

اس بحث سے انہوں نے اسلامی نظام حیات کا وہی نقشہ کھینچا ہے، جس میں معاشی عدل اور انفرادی آزادیوں کی پوری پوری ضمانت دی جا سکتی ہے۔ اس میں جہد و عمل پر سختی سے اصرار کیا گیا ہے، تقلید پرستی، بے عملی اور یاس زدگی اور ماضی پہ رضا رہنے کی کیفیت سے انکار کیا گیا ہے۔ البتہ مصنف نے آخر میں مسلمانوں کے لئے دستوری اور قانونی نظام کا جو نقشہ پیش کیا ہے اور اس کے لئے جو سفارشات مرتب کی ہیں، وہ بعض صورتوں میں عجیب و غریب ہیں۔ مثلاً یہ کہنا کہ بالغ حق رائے دہی کا نظام ہمارے ملک میں بنیادی جمہوریت کے نظام کی طرح ناکام ہو گیا ہے، لہٰذا اس حق کے لئے ایک خاص تعلیمی سند کی شرط لگانا، صرف تین سیاسی جماعتوں کے قیام کی اجازت دینا، قرین عقل و انصاف نہیں، الیکشن کا جو نعم البدل مصنف نے تجویز کیا ہے یا "حقائق و وجوہات" کے ضمن میں بعض طبقوں کو جو مشورے مرحمت فرمائے ہیں ان کا اس کتاب سے غالباً کوئی محل نہ تھا۔ محسوس ہوتا ہے کہ الیکشن کے زبردست ہنگامہ پرور دور سے متاثر ہو کر انہوں نے یہ صفحات کتاب میں شامل کئے تھے اور اب کہ بیشتر معاملات رفت و گذشت ہوئے اب ان پر بحث بیکار ہے۔ البتہ علمائے سو کے دل پسند نعرے "اسلام خطرے میں ہے" کے نعرے کو انہوں نے خوب آڑے ہاتھوں لیا ہے اور جماعت اسلامی کو شوکتِ اسلام کے مظاہرے پر اچھی طرح لتاڑا ہے۔

کتاب میں اسلامی آئین اور معیشت پر جس قدر بحث کی گئی ہے، وہ معلومات سے پُر اور دلچسپ ہے، اور سب سے بڑھ کر کورانہ تقلید کی روش سے پاک ہے۔

اسلام اور ٹالسٹائی

از :- اسلامی مشن، سنت نگر لاہور

صفحات ۵۵ - قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ: ادبستان، چوک لکشمی میکلوڈ روڈ

ٹالسٹائی روس کا شہرۂ آفاق ناول نگار گذرا ہے، لیکن اس سے قطع نظر اس کی حیثیت ایک دردمند اور وسیع النظر مسیحی مفکر کی بھی ہے، جس نے زار کے زمانے میں روس اور یورپ میں انسان کی . بے قدری اور ارباب اقتدار کی زرپرستی اور سفاکانہ عیش کوش کا مشاہدہ، ایک مسیحی کی حیثیت سے کیا اور اسے اپنے ناولوں اور افسانوں میں ادا کرنے کی سعی کی ٹالسٹائی کی انسانیت دوستی کٹر قسم کی مسیحیت کے تابع نہ تھی انسان کی تکریم اور بزرگی اور خلق دوستی کا درس جہاں سے بھی ملا، اس نے بے تکلف قبول کر لیا، چنانچہ وہ پیغمبر اسلام صلعم کی تعلیمات اور قرآن کریم کے ارشادات سے بھی متاثر ہوا۔ اسلام کے فیضان کا ٹالسٹائی نے فراخدلی سے اعتراف بھی کیا ہے اس کتابچے میں ٹالسٹائی کے انہی بیانات کے حوالے شامل کئے گئے ہیں، جن میں اسلامی تعلیمات کا پرتو ملتا ہے۔

پشاور میں عرصۂ دراز سے سمال انڈسٹریز کارپوریشن کا دفتر قائم ہے اور چھوٹے صنعتکاروں کو بسانے کیلئے بہت بڑا رقبہ بھی مخصوص ہو چکا ہے لیکن گذشتہ دس برسوں میں یہ اسکیم کامیاب نہ ہو سکی اور اس طویل عرصہ میں بمشکل تمام چند بااثر لوگ ہی اس سے فائدہ اُٹھا سکے۔ کیونکہ اس کا طریق اس قدر مُشکل، طویل اور صبر آزما ہے کہ کوئی شخص اس سے فائدہ اُٹھا ہی نہیں سکتا اس عرصہ میں سینکڑوں لوگوں نے کارخانے لگانے کے لئے پلاٹ لے کر عمارت کی تعمیر اور کارخانے کی ترقّی کے لئے مجوزہ قرضہ حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن انہیں کامیابی نہیں ہوئی بلکہ انہیں الٹا عملے کی خوشنودی حاصل کرنے اور کام نکلنے کے لئے خاصا نقصان اُٹھانا پڑا ویسے پشاور کے دفتر میں کارپوریشن کا جتنا عملہ پڑا ہے اور گذشتہ دس برسوں میں اس پر جتنا خرچ ہو چکا ہے اس سے ایک پورا صنعتی شہر آباد ہو سکتا تھا لیکن یہ حکومتی کام اور اسکی مصلحتیں ہیں جن میں کوئی دم نہیں مار سکتا۔ اب کنسورشیم قائم کرنے کا نیا شوشہ چھوڑا جا رہا ہے جو لوٹ مار کا نیا ذریعہ ثابت ہوگا۔ ہم انتظامیہ کو مشورہ دیں گے کہ خدا کے لئے اس نئی اسکیم پر لاکھوں روپے برباد کرنے کے بجائے کارپوریشن کے نظام ہی کو درست کر ڈالیں تاکہ یہی روپیہ چھوٹی صنعتوں کی ترقّی کے کام آئے۔

بلدیہ پشاور نے کچہری دروازہ کے باہر دوکانوں کی قلّت کے پیش نظر کچھ دوکانیں تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا تاکہ غریب اور بیکار لوگ اس سے فائدہ اُٹھا سکیں لیکن اب جبکہ یہ دوکانیں تعمیر ہو چکی ہیں بلدیہ کے ایڈمنسٹریٹر بریگیڈیئر خلجی نے اعلان کیا ہے کہ انہیں نیلام کیا جائے گا اور سب سے بڑی بولی دینے والوں سے تین سال کا پیشگی کرایہ لیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کوئی غریب و ضرورت مند شخص یہ دوکانیں حاصل کرنے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا یہ تو وہی لیں گے جنہیں دستِ غیب کی امداد حاصل ہے اور جن کے پاس پیسے کی کوئی کمی نہیں۔ پشاور کے غریب عوام بلدیہ کے ایڈمنسٹریٹر کے اس فیصلے کے خلاف شدید احتجاج کر رہے ہیں انہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ اگر تین سال کے پیشگی کرائے کی شرط نہ واپس لی گئی تو وہ اِن دوکانوں کا نیلام نہیں ہونے دیں گے اور بلدیہ کے دفتر کے سامنے بھوک ہڑتال کرینگے انہوں نے حکومت سے ایڈمنسٹریٹر کی برطرفی کا بھی مطالبہ کیا ہے۔

حیرت اس بات کی ہے کہ ہمارے اعلےٰ حکام لوگوں کو تو مشورہ دیتے ہیں کہ کرائے کی جائیداد کی پگڑی لینے اور کرایہ بڑھانے سے احتراز کریں لیکن بلدیہ جو ایک سرکاری ادارہ ہے اس کا ایڈمنسٹریٹر سرکاری جائیداد کے نیلام کی صورت میں کئی گنا ظالمانہ کرائے وصول کرنے اور تین سال کے پیشگی کرائے کی صورت میں پگڑیاں حاصل کرنے کی جس ناجائز کوشش میں مصروف ہے وہ اسے اس حرکت سے باز رکھنے کے لئے کوئی اقدام نہیں کرتے۔

امین مغل

> لاہور میں طلبہ کے نعرے "سی ایس پی ہٹاؤ نوکر شاہی مردہ باد افسر شاہی مردہ باد
> بیکاری الاؤنس دو، روزگار - روزگار - روزگار"

طالب علموں کی دنیا

ہمیں ڈگری نہیں روزگار چاہیئے

انجینئر کا مستقبل موجودہ معاشی نظام میں محفوظ نہیں

انجینئرنگ یونیورسٹی میں ایک نئی تنظیم کا قیام عمل میں آیا ہے۔ انجینئرنگ سٹوڈنٹس فرنٹ۔ اس فرنٹ نے پانچ مطالبات کے لئے جدوجہد شروع کر دی ہے۔

۱۔ سی۔ ایس۔ پی کے غلبہ کا خاتمہ

۲۔ بے روزگار انجنیئروں کے لئے روزگار

۳۔ انجنیئروں کے لئے کلاس 1 کی منظوری

۴۔ یونیورسٹی انتظامیہ میں طلبہ کی نمائندگی

۵۔ قومی مفادات اور ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے سائنسی بنیادوں پر ٹیکنیکل اور تعلیمی پالیسیوں کی تشکیل

ترقی پسند طالب علموں کی اس تنظیم نے اپنے پمفلٹ میں کہا ہے کہ "جس معاشرے میں روزگار اور علم و فن کا تعلق ٹوٹ جائے وہاں صرف بے یقینی اور بغاوت پیدا ہوتی ہے۔" فرنٹ نے شکایت کی ہے کہ نوکر شاہی اور پیشہ ور صنعت کاروں کا گٹھ جوڑ انجینئرنگ کے پیشہ کے مفادات کے منافی ہے۔ سب سے بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ فرنٹ سمجھتا ہے کہ پاکستان ایسے ترقی پذیر ملک میں انجینئرنگ (بلکہ تمام علوم و فنون) کا مستقبل اس وقت تک محفوظ نہیں جب تک اس ملک کا پورا معاشی ڈھانچہ تبدیل نہیں کیا جاتا۔" ہمارے طلباء کے ہاں سیاست کا مطلب صرف ہنگامی سیاست ہی رہا ہے، لیکن اس فرنٹ کی رائے میں عملی سیاست کا رخ متعین کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مسائل کا سائنسی اور غیر جذباتی انداز میں تجزیہ کیا جائے اور واضح تاریخ کی روشنی میں لائحہ عمل مرتب کیا جائے۔"

مستقبل کے انجنیئروں کا مظاہرہ

۱۹ فروری کو جب لاہور کی بلند و بالا واپڈا ہاؤس بلڈنگ کے اندر الیکٹریکل انجنیئرز کی کونشن کا افتتاح کرنے جب گورنر پنجاب تشریف لائے تو انجینئرنگ اسٹوڈنٹس فرنٹ کے زیر اہتمام چھ سو طالب علموں نے پر امن مظاہرہ کیا۔ انجینئرنگ کے طلبہ سب سے پہلے شملہ پہاڑی کے نزدیک جمع ہوئے اور وہاں سے جلوس کی شکل میں واپڈا ہاؤس آئے۔ اور تقریباً ۳ گھنٹے تک مال روڈ کی دونوں جانب اور واپڈا ہاؤس کے اردگرد کھڑے رہے۔ سید اصغر علی شیرازی نے فرنٹ کی جانب سے ایک یادداشت گورنر پنجاب کو پیش کی۔

چند ایک نعرے ملاحظہ ہوں: "سی ایس پی، ہٹاؤ، نوکر شاہی مردہ باد، افسر شاہی مردہ باد، بے روزگار انجینئروں کو روزگار یا بیکاری الاؤنس دو، روزگار، روزگار، روزگار، ہمیں ڈگریاں نہیں روزگار چاہیئے" قاضی کمیٹی کی رپورٹ کی سفارشات پر عمل کیا جائے۔

آپ کو شاید یقین نہ آئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ لاہور میں ایک ایسا کالج بھی ہے جو تقسیم ہند سے قبل بڑی شہرت کا مالک تھا، اور جس کی انتظامیہ دولت و ثروت کے اعتبار سے اب بھی صاحب حیثیت ہے۔ لیکن اس میں طالب علم کمروں کی بجائے خیموں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ایم اے او کالج کے نوائے طلباء کے یونٹ کے صدر محمد جاوید نوشاہی نے اس کا انکشاف ایک پریس کانفرنس میں کیا۔

پنجابی ادبی مجلس کی آواز

اسلامیہ کالج سول لائنز، انجمن حمایت اسلام کے زیر اہتمام وہ ادارہ ہے جہاں سے ۱۹۶۹ء میں تین سینئر اساتذہ کو ٹریڈ یونین سرگرمیوں کی پاداش میں نکالا گیا تھا۔ نظریہ آتا تھا کہ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل کے مطابق وقت کے ساتھ ساتھ انجمن کی اس صریح دھاندلی کو فراموش کر دیا گیا ہے۔ لیکن اچانک ایک دھماکہ ہوا جب اسلامیہ کالج ہی میں ان کے حق میں ایک آواز اٹھی، اور یہ مطالبہ کیا گیا کہ ان اساتذہ کو واپس بلایا جائے۔

کالج کی پنجابی ادبی مجلس نے اپنا چوتھا سال چند روز ہوئے شروع کیا تھا۔ مجلس کے سیکرٹری آصف شاہکار پنجابی کے اچھے شاعر ہیں۔ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر علامہ علاؤالدین صدیقی کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ (پنجابی سے ترجمہ) "ایک وقت تھا جب پنجاب کے کالجوں میں پنجابی کی بات کی جاتی تھی تو یار لوگ مذاق اڑاتے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ پنجابی تو سکھوں کی زبان ہے۔ اوّل تو یہ مذاق ویسے بھی کسی قوم کے بارے میں توہین آمیز ہوتا ہے مگر اس سے مراد یہ لی جاتی تھی کہ پنجابی بیوقوفوں اور جاہلوں کی زبان ہے۔" آصف شاہکار کو شکایت تھی کہ لوگوں کا کہنا تھا کہ پنجابی میں ہر لفظ کے دو معنی ہوتے ہیں۔ ایک سنجیدہ اور دوسرا سوقیانہ۔ پھر یہ کہا جاتا تھا کہ پنجابی زبان گالیوں کے لئے مخصوص ہے۔ بڑی حد ہوئی تو یار لوگ یہ کہہ دیتے تھے کہ پنجابی اردو کی بگڑی ہوئی شکل ہے یا ایک بولی ہے۔ لیکن آصف شاہکار کا کہنا تھا کہ ذخیرۂ الفاظ کے اعتبار سے پنجابی دنیا کی عظیم زبانوں میں ہے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ اس میں ساڑھے چار لاکھ لفظ ہیں۔ اس کا لوک ادب اور تخلیقی ادب موجود ہے۔ انہوں نے کہا، اب حالات بہت حد تک بدل گئے ہیں لیکن ان کی سوسائٹی کو چند سو روپیہ گرانٹ ملتی ہے۔ جبکہ دوسری سوسائٹیوں کو کئی کئی ہزار

رہے اس کے برعکس "سرحد کے پار پنجاب کا ایک ٹکڑا ہے جس کو پنجاب کے جسم سے الگ کیا گیا ہے۔ وہاں بھی پنجابی قوم کے فرد بستے ہیں، پچھلے ۲۲ سالوں میں انہوں نے ارسطو، سقراط شیکسپیر کے علاوہ دنیا کے دوسرے تمام بڑے بڑے لکھنے والوں کا نہ صرف پنجابی میں ترجمہ کر لیا ہے بلکہ وہاں میڈیکل، انجینیرنگ اور ایم ایس سی تک تعلیم بھی پنجابی میں دی جا رہی ہے۔ اُن کے ریڈیو پروگرام پنجابی میں پیش کئے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہندوستان کی قومیت کو کبھی خطرہ نہیں لاحق ہوا۔"

آصف شاہکار نے اپنے سپاسنامہ میں کہا کہ پنجابی زبان کے بارے میں آج کل بڑی اچھی اچھی باتیں کی جا رہی ہیں لیکن اِن باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ لوگ اس زبان کے بارے میں سنجیدگی سے صرف اسی وقت سوچیں گے جب اس کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے گا۔

پنجابی کلاسوں کے "اسلام پسند" اُستاد

پنجاب یونیورسٹی میں اس سال سے ایم اے پنجابی کی کلاسیں شروع کر دی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ شاہ حسین کالج میں بھی ایم اے پنجابی کی کلاس کا اجرا کر دیا گیا ہے۔ آصف شاہکار نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ "پنجابی زبان کے بارے میں پنجاب یونیورسٹی کا اپنا رویہ بھی کچھ اتنا حوصلہ افزا نہیں"۔ اسکے ثبوت میں انہوں نے پنجابی ایم اے کورس کا حوالہ دیا۔ انہوں نے کہا کہ شعبۂ پنجابی میں بڈھے بڈھے اصحاب کو رکھا گیا ہے جن کی نوجوان عزت تو کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی سمجھتے ہیں کہ وہ اب اس قابل نہیں کہ کام کاج کر سکیں۔ انہوں نے کہا کہ بعض ایسے اصحاب کو پنجابی زبان کا اُستاد مقرر کیا گیا ہے جن کا پنجابی ادبیات ولسانیات میں کوئی مقام نہیں۔ مثلاً ڈاکٹر وحید قریشی جن کی ساری پونجی اُردو کتابوں کے دیباچے اور ہفت روزہ "زندگی" میں ترقی پسند تحریک کے خلاف سینکڑوں صفحوں کی سیاہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب اور خضر تمیمی پر یہ الزام بھی لگایا گیا کہ وہ ایک سیاسی جماعت (جماعت اسلامی) سے متعلق ہیں۔ اس کے برعکس، ایسے لوگوں کو نظر انداز کیا گیا ہے جو واقعی پنجابی کے عالم ہیں۔ مثلاً شریف کنجاہی اور نجم حسین سید۔ آصف شاہکار نے ایک اور کوتاہی کی طرف بھی مؤدبانہ اشارہ کیا اور وہ یہ تھا کہ ایم اے پنجابی کا کورس میٹرک کے طالب علموں کے لئے تو مناسب ہے مگر ایم اے کی اعلیٰ ڈگری کے ہرگز شایانِ شان نہیں۔

آصف شاہکار نے ایرک سپرین، منظور احمد وغیرہ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ اس کالج میں علم کا مینار تھے، اور آزادیٔ فکر کا مظہر، انھوں نے پنجابی ادبی سوسائٹی کے قیام کے لئے انتظامیہ کی مخالفانہ روش کا مقابلہ کیا، اور انہیں سوسائٹی کے قیام پر مجبور کیا۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ ان کو واپس کالج میں بُلایا جائے۔

وائس چانسلر نے وعدہ کیا کہ آصف شاہکار کے سپاسنامہ میں پیش کی گئی باتوں کو سنڈیکیٹ میں موضوعِ بحث بنایا جائے۔

اسلامیہ کالج میں علامتی ہڑتال

۱۷ فروری کو اسلامیہ کالج سول لائنز کے طلبہ نے فیصلہ کے مطابق علامتی ہڑتال کی اور کالج کے حدود میں پُرامن مظاہرہ کیا۔ علامتی ہڑتال اور مظاہرہ اسٹوڈنٹس یونین اور طلبہ کی ایکشن کمیٹی کی اپیل پر کیا گیا تھا۔ اسٹوڈنٹس یونین کے صدر محمد سلیم کے بارے میں انتظامیہ کا خیال تھا کہ وہ اس کے حامی ہیں، لیکن اس کی پریشانی کی انتہا نہ رہی جب محمد سلیم صاحب کی زیرِ قیادت علامتی ہڑتال کا آغاز کر دیا گیا۔ صدر نے کالج انتظامیہ اور بعض اساتذہ پر الزام لگایا ہے کہ انہوں نے طلبہ کی پُرامن علامتی ہڑتال کے دوران طلبہ کو زبردستی کلاسوں میں بٹھانے کی کوشش نہ کی اور انہیں دھمکیاں دیں۔ مجلسِ عمل کے کنوینر آصف شاہکار نے ایک بیان میں حکومت سے مطالبہ کیا کہ انجمن حمایت اسلام کے حسابات کی پڑتال کے لیے ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کرے۔

علامتی مظاہرہ دوسرے روز بھی جاری رہا۔ طلبہ کے مطالبات میں اہم مطالبے یہ ہیں: انجمن حمایت اسلام اور کالج انتظامیہ طلبہ کے جمہوری حقوق بحال کرے؛ فیسوں میں ۳۰ فیصد کمی کی جائے؛ کسی طالب علم کا داخلہ روکا نہ جائے؛ ادبی اور ثقافتی سوسائٹیوں کو آزادیٔ کار دی جائے؛ اُستاد کی حیثیت مشیر کی ہو نہ کہ صدر کی؛ کالج میگزین اور جرنلزم کے طالب علم مدیروں کو پورا مُدیر سمجھا جائے؛ جرمانہ سسٹم بند کیا جائے؛ اساتذہ کو جمہوری آزادی دی جائے۔ اور "نکلے ہوئے حق پرست اساتذہ کو واپس بُلایا جائے" وغیرہ وغیرہ۔

ان مطالبات سے ظاہر ہوتا ہے کہ طلبہ کی ایک بنیادی شکایت یہ ہے کہ اُن کو تخلیقی اظہار کے لئے جمہوری مواقع مہیا نہیں کئے جاتے۔

پتہ چلا ہے کہ انتظامیہ نے ان کے بعض چھوٹے چھوٹے مطالبات تسلیم کر لیے ہیں یعنی، دوسرے لفظوں میں، لڑائی جھگڑے کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔ طالب علموں کے والدین کو بُلا کر پریشان کرنے کا منصوبہ بھی بنایا گیا ہے!

"مردہ زندہ ہو گیا": یعنی پنجاب یونیورسٹی میں اسٹوڈنٹس یونین چار سال کے بعد بحال ہو گئی۔ آزاد کے نمائندہ کے کہنے کے مطابق، طالب علموں کی تنظیم کو ۶۷-۱۹۶۶ء میں وائس چانسلر حمید احمد خاں نے معطل کر دیا تھا، ۱۹۶۸ء کے اواخر میں طلبہ نے یہ فیصلہ بدلوا لیا، لیکن مارشل لاء کے نفاذ کے باعث انتخابات ۱۹۶۹ء کی بجائے ۱۹۷۰ء میں ممکن ہو سکے لیکن اسلامی جمعیت طلبہ کے رکن اور نومنتخب اُمیدواروں حافظ محمد ادریس اور اُن کے ساتھیوں نے جب وائس چانسلر کے گھر پر دھاوا بول دیا تو یونین رسمی طور پر بحال نہ ہو سکی۔ اس سال کے انتخابات میں بائیں بازو سے منسوب صرف ایک اُمیدوار کامیاب ہوئے، نائب صدر: راشد بٹ؛ یہی وجہ ہے کہ بعض مبصرین کے کہنے کے مطابق، اس سال کی تقریب میں جماعت اسلامی کے رہنما بالالتزام موجود تھے۔ آڈیٹوریم "ہمیں روزگار چاہیئے، ہمیں ڈگریاں نہیں نوکریاں چاہیئیں" کے نعروں سے گونجتا رہا۔ یونین کے صدر حفیظ خاں نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں طلبہ کا گیارہ نکاتی پروگرام پیش کیا۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ پنجاب یونیورسٹی کو نوکرشاہی کے اثر سے آزاد کر کے خود مختاری دی جائے؛ چانسلر حکومت کا نمائندہ نہ ہو؛ یونیورسٹی سینیٹ بحال کی جائے؛ آئین میں روزگار کی عملی ضمانت دی جائے؛ مفت تعلیم کی طرف قدم بڑھایا جائے؛ حفیظ خاں نے پنجاب یونیورسٹی میں ہونے والے لاکھوں روپوں کی خُرد بُرد کی تحقیقات کا مطالبہ کیا گیا۔

یونیورسٹی کے مجلّے کی طباعت کیوں روکی گئی؟

اب یونیورسٹی کی بات چل نکلی ہے تو اس کے ادبی مجلّہ محور کی بات بھی ہو جائے۔ اس کے دو سو صفحے پریس میں چھپ چکے تھے جب باقی ماندہ مسوّدے کی طباعت روک دی گئی۔ روکنے والے صاحب شعبۂ امور طلبہ کے سابق مشیر جناب خواجہ غلام صادق بیان کئے جاتے ہیں۔ خواجہ صاحب، مشہور و معروف اسلام پسند ہیں جو وائس چانسلر کے منظورِ نظر بتلائے جاتے ہیں۔ شعبۂ فلسفہ میں آجکل ریڈر ہیں، اِن کے بارے میں ایک اسکینڈل یہ بھی ہے کہ ان کو بے شمار غیر ملکی سند یافتہ اور بہتر قابلیت کے مالک اصحاب کے مقابلے میں انھیں ترجیح دی گئی ہے۔ حالانکہ تقرری بورڈ نے انکے خلاف فیصلہ دیا تھا۔ خواجہ غلام صادق یونیورسٹی میں آنے سے پہلے اسلامیہ کالج سول لائنز میں فلسفہ کے اُستاد تھے سابق وائس چانسلر کے زمانہ میں وہ یونیورسٹی میں آئے تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ رسالے میں یونیورسٹی انتظامیہ پر تنقید کی گئی تھی، جس کا پتہ اُن کو چل گیا، اس کے علاوہ خواجہ غلام صادق اور محور کے حلقۂ ادارت جو ترقی پسند طلبہ پر مشتمل ہے، کے درمیان بڑے عرصہ سے رنجش چلی آ رہی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ رسالہ کی اشاعت عین درمیان میں روک دی گئی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ رسالہ کے مشیر پروفیسر وقار عظیم نے اس اقدام کے خلاف وائس چانسلر سے سخت احتجاج کیا ہے۔

گول باغ کے اس سورج کی طرح سرمایہ داری کا سورج دُنیا بھر میں ڈوب رہا ہے: مرزا ابراہیم

انقلاب صرف مزدوروں کی رہنمائی میں آسکتا ہے۔ یہ تھا گزشتہ ہفتے لاہور میں محنت کشوں کا بنیادی نعرہ۔ ہمیں روزگار دو۔ ہمیں روزگار کی دستوری ضمانت دو۔ ہمیں جمہوری آزادی دو۔ ان نعروں کی آواز سے کوچہ و بازار گونج رہے ہیں۔

متوسط طبقہ آج کل چھ نکات اور مضبوط مرکز کے چکر میں ہے، لیکن محنت کش طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ سب بحثیں بیکار ہیں اس وقت تک جب تک آئین میں روزگار اور بنیادی حقوق کی ضمانت نہیں دی جاتی۔

"جائنٹ لیبر کونسل کا یہ کنونشن فیصلہ کرتا ہے کہ اس کنونشن میں منظور شدہ قراردادوں پر عمل درآمد کرانے کے لئے متحدہ جدوجہد کا آغاز کیا جائے۔" یہ اُس قرارداد کے لفظ ہیں جو لاہور میں ترقی پسند مزدور فیڈریشنوں کے نمائندوں نے ۲ر دسمبر کو منظور کی۔ اور پھر ۱۶ر جنوری کو پورے مغربی پاکستان میں یوم گرانی منایا گیا۔ اور ۱۳ر فروری سے ۲۰ر فروری تک پنجاب، سندھ، صوبۂ سرحد اور بلوچستان کے صوبوں میں ہفتۂ مطالبات منایا گیا۔ یہ ترقی پسند تنظیمیں ہیں:۔ ویسٹ پاکستان فیڈریشن آف ٹریڈ یونین (بشیر بختیار) ویسٹ پاکستان ورکرز فیڈریشن (شمیم واسطی) قومی مزدور محاذ رابطہ کونسل کراچی (نایاب نقوی) اور ویسٹ پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن (مرزا محمد ابراہیم) ہفتہ مطالبات میں مزدوروں نے ہر صنعتی مقام پر جلسہ جلوس اور مظاہرے کئے اور

۱۔ دستور میں مزدوروں کے لئے بنیادی حقوق کی ضمانت
۲۔ فرسودہ مزدور قوانین میں مناسب تبدیلی،
۳۔ ریاستوں، مالاکنڈ ایجنسی اور قبائلی علاقوں پر مزدور قوانین کے اطلاق،
۴۔ سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کے مزدوروں کو انجمن سازی کی مکمل آزادی،
۵۔ پے کمیشن کی سفارشات کے فوری نفاذ،
۶۔ ورک چارج سسٹم کے خاتمہ،
۷۔ پنشن اور گریجویٹی کے حقوق،
۸۔ انتقامی کارروائیوں کے تحت ملازمت سے برطرف مزدوروں اور صحافیوں کی ملازمت پر بحالی۔
۹۔ مہنگائی کے خاتمہ
۱۰۔ کم از کم اُجرت میں اضافہ کے مطالبات دہرائے گئے

ہفتہ مطالبات منانے کے لئے پچھلے مہینے سے تیاریاں شروع کر دی گئی تھیں۔ گرانی میں روز افزوں اضافہ اور مزدور رہنماؤں کی تنظیمی سرگرمیوں کے باعث ہفتہ مطالبات کی تقریبات میں غیر معمولی جوش و خروش کا اظہار کیا گیا۔

لاہور میں اس سلسلہ کی سب سے عظیم الشان تقریب وہ جلوس تھا۔ جو ۱۳ر فروری کو نکالا گیا۔ پروگرام کے مطابق، شاہدرہ فیکٹری سے ایک بجے کے قریب، ویسٹ پاکستان فیڈریشن آف ٹریڈ یونین کے جنرل سیکرٹری خورشید احمد، عبدالحمید بٹ وغیرہ کے زیر قیادت شاہدرہ، مریدکے، شیخوپورہ روڈ اور کالا شاہ کاکو کے صنعتی اداروں کے مزدوروں کا جلوس جی۔ ٹی۔ روڈ کے راستے لیبر ہال پر پہنچا، ایک جلوس جو ریلوے سے مرزا محمد ابراہیم صدر پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن، کی زیر قیادت چلا، یہاں آکر پہلے جلوس میں شامل ہو گیا۔ اور پھر مشترکہ جلوس بشیر احمد



بشیر بختیار

بختیار، صدر ویسٹ پاکستان فیڈریشن آف ٹریڈ یونین، مرزا محمد ابراہیم اور سید ریاض حیدر زیدی، نائب صدر ویسٹ پاکستان ورکرز فیڈریشن کی زیر قیادت چوک لکشمی، میکلوڈ روڈ جی۔ پی۔ او اور مال روڈ سے گذرتا ہوا پونے پانچ بجے گول باغ میں پہنچا جہاں اس سے مختلف رہنماؤں نے خطاب کیا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق، یہ جلوس پچھلے سال کے یوم مئی کے جلوس سے بڑا تھا۔

جناب بشیر بختیار نے کہا کہ محنت کشوں نے مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کو اس نعرے پر ووٹ دئے تھے: "جہیڑا واہوے اوہی کھاوے: سوشلزم آوے ای آوے۔" ہمیں چھ نکات یا آٹھ نکات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ محنت کش عوام کے ساتھ جو وعدے کئے گئے ہیں ان پر دیانتداری سے عمل کیا جائے۔ اور آئین میں اس بات کی ضمانت دی جائے کہ پاکستان میں انسان کی انسان کے ہاتھوں لوٹ کھسوٹ نہیں ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ اگر قومی اسمبلی کے ارکان نے عوام کی امنگوں اور ضرورتوں کے مطابق آئین نہ بنایا تو انہیں اسمبلی سے کھینچ کر باہر نکال دیا جائے گا۔

جناب خورشید احمد نے افسوس کا اظہار کیا کہ ہمارے بعض لیڈر آئین کے خدوخال اور تقسیم اختیارات پر جھگڑ رہے ہیں۔ محنت کش عوام کی ضرورت یہ ہے کہ انہیں باعزت زندگی گذارنے کے موقعے ملیں۔ اس کے بغیر بننے والا آئین بے معنی ہوگا۔

اسمبلیوں سے زیادہ اُمید نہیں کی جا سکتی

مزدور رہنما مرزا محمد ابراہیم نے کہا:۔ جس طرح گول باغ پر اس وقت سورج ڈھل رہا ہے اسی طرح آج ساری دنیا میں سرمایہ داری کا سورج غروب ہو رہا ہے، مظلوم انسانیت جگہ جگہ سرمایہ داری کے خلاف سینہ تان رہی ہے۔ لیکن محنت کشوں کو اس بات کا بخوبی علم ہے کہ یہ نظام خود بخود ختم نہیں ہوگا۔ دولتمند ہمیشہ عوام کے ساتھ خوش آئند وعدے کرتے آئے ہیں۔ لیکن اپنے وعدے کبھی پورے نہیں کرتے۔ انہوں نے احمد رضا خاں قصوری، نو منتخب امیدوار قومی اسمبلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ گو ان کی طرح کے چند جوشیلے نوجوان اسمبلی میں پہنچ گئے ہیں لیکن وہاں نوّے ہزار ایکڑ اراضی کے مالک طالب المولیٰ بھی اسمبلی میں موجود ہیں۔ اس لئے اسمبلیوں پر ضرورت سے زیادہ امید رکھنا خود فریبی ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ مزدوروں، کسانوں، کلرکوں، استادوں، چھوٹے دکانداروں اور نچلے متوسط طبقے کو متحد ہو کر اپنی انقلابی جدوجہد جاری رکھنی چاہیئے۔

جناب احمد رضا خاں قصوری اور پیکجز ورکرز یونین کے جنرل سکریٹری عبدالرحمٰن کے علاوہ انجمن جمہوریت پسند خواتین کی رہنما بیگم نسیم شمیم اشرف ملک نے بھی تقریر کی۔ بیگم صاحبہ ایک شعلہ بیان مقررہ ہیں۔ انہوں نے کہا کہ عورتیں اب اپنے مزدور بھائیوں کے ساتھ آن ملی ہیں وہ لوگ جو مزدوروں کی توجہ ان کے اصل مسائل سے ہٹانا چاہتے ہیں وہ ان کے دشمن ہیں۔ انہوں نے اقتدار کی جلد از جلد منتقلی پر زور دیا۔

اس جلوس میں مزدوروں کے علاوہ انجمن جمہوریت پسند خواتین کے زیر اہتمام مزدور اور غریب عورتوں نے بھی شرکت کی۔

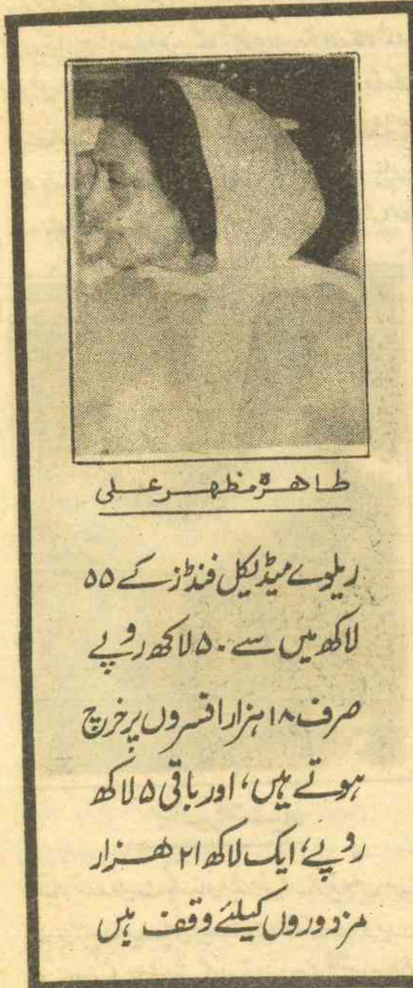
آئینی اور سیاسی اختلافات کی آڑ میں مزدوروں کے مطالبات ملتوی نہیں کئے جا سکتے

پروگرام کے مطابق، پورے شہر میں ہفتۂ مطالبات کے سلسلہ میں جلسے کئے گئے۔ ادارہ آب رسانی کی ٹیوب ویل، ڈرائیورز واٹر سپلائی اینڈ سیوریج سٹاف یونین ایک پرانی ترقی پسند ٹریڈ یونین ہے۔ اس کے زیر اہتمام ہفتہ بھر مختلف مقامات پر اجتماعات کئے گئے۔ ۱۶ فروری کو کوٹ لکھپت میں ایک بھاری جلسہ ہوا جس سے مرزا محمد ابراہیم، خورشید احمد، ریاض حیدر زیدی کے علاوہ پیکجز ورکرز یونین کے صدر الطاف حسین بلوچ، جنرل سکریٹری عبدالرحمٰن، محمد اکبر اور محاذ متحدہ گلبرگ کے گلزار احمد نے بھی تقریریں کیں۔ ریاض حیدر زیدی جو ویسٹ پاکستان ورکرز فیڈریشن کے نائب صدر ہیں، نے کہا کہ لاہور میں اتفاق فونڈری، پیکجز اور کوٹ لکھپت کی دوسری فیکٹریوں کے مالکوں نے جبری بھرتیاں شروع کر دی ہیں۔ الطاف بلوچ صدر اتفاق فونڈری اینڈ ورکشاپ ایمپلائز یونین نے فونڈری اور پیکجز کی انتظامیہ پر الزام لگایا کہ وہ غنڈوں کی مدد سے ملازمین پر تشدد کی کارروائیاں کر رہی ہیں۔

ریلوے ورکشاپس کا گھیراؤ

ہفتۂ مطالبات کے چوتھے روز، یعنی ۱۹ فروری کو ہزاروں ریلوے مزدوروں نے دوپہر کے وقت ریلوے کے ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ ورکشاپس کا پندرہ منٹ تک گھیراؤ کیا۔ گھیراؤ سے پہلے ایک جلسہ ہوا جس سے مرزا محمد ابراہیم اور انجمن جمہوریت پسند خواتین کی رہنماؤں طاہرہ مظہر علی اور نسیم شمیم اشرف ملک نے خطاب کیا۔ مرزا صاحب نے کہا کہ ملک کا موجودہ سیاسی بحران دراصل سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور نوکر شاہی کے گٹھ جوڑ کا نتیجہ ہیں جس کا مقصد مزدوروں، کسانوں اور دوسرے محنت کش عوام کے مسائل سے توجہ ہٹانا ہے۔ انہوں نے کہا سیاسی رہنماؤں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ مصائب میں الجھے ہوئے عوام اپنے مسائل کے حل کے لئے بے قرار ہیں اور وہ ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیں گے کہ آئینی اور سیاسی اختلافات کا نام لے کر ان کے مسائل کو پس پشت ڈال دیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ سرکاری زمینوں کی پٹہ پر کسانوں کو دینے کی اسکیم غلط ہے۔ محکمہ ریلوے کی آمدنی کا بڑا حصہ اس وقت ریلوے افسران پر خرچ ہوتا ہے۔ مثلاً ریلوے کے میڈیکل فنڈز کے ۵۵ لاکھ میں سے ۵۰ لاکھ روپیہ صرف اٹھارہ ہزار افسروں پر خرچ ہوتے ہیں۔ اور باقی پانچ لاکھ روپیہ ایک لاکھ ۲۱ ہزار مزدوروں کے لئے وقف کیا جاتا ہے۔

محنت کش طبقے میں اضطراب وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا جا رہا ہے۔ پنجاب گورنمنٹ پریس ورکرز یونین نے انتظامیہ کو متنبہ کیا ہے کہ اگر پریس ورکرز کے جائز مطالبات تسلیم نہ کئے گئے تو پریس کے دو ہزار ملازمین ۲۳ فروری کی رات کو ۱۲ بجے سے ہڑتال کر دیں گے۔ ۱۷ فروری کو ٹیلیفون آپریٹرز کی مجلس عمل نے اعلان کیا کہ ملک کے دونوں حصوں کے پندرہ ہزار آپریٹرز ۱ مارچ کو علامتی ہڑتال کریں گے۔ اور منظوری نہ ہونے کی صورت میں ۱۵ مارچ کو غیر معینہ مدت کے لیے ہڑتال کر دیں گے۔ مجلس عمل کے



طاہرہ مظہر علی

ریلوے میڈیکل فنڈز کے ۵۵ لاکھ میں سے ۵۰ لاکھ روپے صرف ۱۸ ہزار افسروں پر خرچ ہوتے ہیں، اور باقی ۵ لاکھ روپے، ایک لاکھ ۲۱ ہزار مزدوروں کیلئے وقف ہیں

ارکان نے بتایا کہ ہڑتال کا مقصد محض ان فیصلوں پر عمل کرانا ہے جو انتظامیہ نے ۱۹۶۹ء میں کئے تھے اور جن کی جون ۱۹۷۰ء میں توثیق کر دی تھی۔ انہوں نے کہا کہ ۲۵ فروری سے ۲ مارچ تک ہفتۂ احتجاج منایا جائے گا۔ ۱ مارچ کو علامتی ہڑتال کی جائے گی۔ ان کے ۲۵ مطالبات میں اہم مطالبے یہ ہیں کہ ایسوسی ایشن کے سابق نائب صدر جان مارٹن کو ملازمت پر بحال کیا جائے، پانچ سال تک ملازمت کر لینے والے آپریٹرز کو ٹیلی کمیونیکیشن ٹیکنیشین کے سکیل میں ترقی دی جائے۔

ایک دواساز ادارے (پی۔ ڈی۔ ایچ لیبارٹریز) کی یونین نے الزام لگایا ہے کہ ان کا ایک ممبر عزیز محمد بوائلنگ سیکشن کے غیر صحت مند ماحول میں کام کرتے ہوئے تپدق کا شکار ہو گیا۔ اور جب یونین کو تعزیتی اجلاس کرنے کے لئے چھٹی نہ ملی تو انہوں نے اوزار چھوڑ ہڑتال کر دی۔

۱۸ فروری کو مشرقی پاکستان کے کم تنخواہ پانے والے سولہ ہزار ملازموں نے ہڑتال کر دی۔ اور اسی دن پنجاب کے محکمہ تار و ٹیلیفون کے کلرکوں نے بھی ہڑتال کی دھمکی دیدی۔ پنجاب ٹیلیفون، ٹیلیگراف کلریکل یونین نے کارکنوں کے مسائل پر غور کرنے کے لئے اعلیٰ سطح کی کمیٹی کی تشکیل کا بھی مطالبہ کیا ہے۔ مطالبہ کیا گیا کہ کلرکوں کو پندرہ روپے ماہوار سپیشل تنخواہ دی جائے۔ سلیکشن گریڈ کے لوگوں کو ڈائرکٹر جنرل ٹیلیفون و ٹیلیگراف کے وعدے کے مطابق پچاس روپے ماہوار چارج الاؤنس دیا جائے اور کلریکل اسٹاف کو بھی ٹیلی کوم الاؤنس دیا جائے۔ وغیرہ وغیرہ

ڈاک کی ہڑتال

پی ڈبلیو آر ٹرین کلرکس ایسوسی ایشن نے کہا ہے کہ اگر ریلوے انتظامیہ نے ایک ماہ تک ان کے مطالبات تسلیم نہ کئے تو ٹرین کلرک غیر معینہ مدت کے لئے ہڑتال کر دیں گے۔ ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری مولوی نذیر احمد نے کہا ہے کہ ٹرین کلرکوں نے کئی سال سے ریلوے انتظامیہ سے یہ مطالبہ کر رکھا ہے کہ ان کے گریڈ اونچے کئے جائیں۔ لیکن بیس سال گذرنے کے بعد بھی یہ مسئلہ حل نہیں کیا گیا۔

مشرقی پاکستان کی ڈاک ہڑتال کے بعد، مغربی پاکستان کے محکمہ ڈاک و تار کے بیس ہزار ملازمین کی نمائندہ انجمنوں نے بھی ہڑتال پر چلے جانے کا اعلان کر دیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ مغربی پاکستان میں بھی محکمہ ڈاک و تار کا پورا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ انہوں نے کہا ہے کہ ۲۲ فروری تک مشرقی پاکستان کے ڈاک ملازمین کے مطالبات مان لئے جائیں۔ ورنہ ۲۳ فروری سے ہڑتال کر دی جائے گی۔ ہڑتال کا فیصلہ کرنے والوں میں پوسٹ مین اینڈ لوئر گریڈ سٹاف یونین، آل پاکستان آر۔ ایم ایس ایمپلائز یونین، آل پاکستان ٹیلیگراف ایسوسی ایشن، پنجاب پراونشل ریلوے میل سروس ایمپلائز یونین، آل پاکستان پوسٹ آفس کلریکل یونین، اور فیڈریشن آف پاکستان پوسٹ آر۔ ایم۔ ایس، اینڈ ٹیلی کمیونیکیشن ایمپلائز یونین شامل ہیں۔



لاؤس میں امریکی فوجوں کی پٹائی

سامراجی حکمراں گھر میں بھی رسوا ہو چکے ہیں

ویت نام میں پٹائی کے بعد امریکی سامراج کی اسلحہ ساز فیکٹریوں میں اسلحہ کا اتنا ڈھیر لگ گیا ہے کہ اسے مجبوراً لاؤس اور کمبوڈیا میں اس ذخیرے کی کھپت کا انتظام کرنا پڑا۔ یوں تو کمبوڈیا میں امریکہ کی مداخلت ایک طویل عرصے سے جاری ہے لیکن ۳۰ اپریل ۱۹۷۰ء کو امریکہ کے صدر نکسن نے کمبوڈیا پر حملے کا باضابطہ اعلان کر دیا۔ پچھلے چند دنوں لاؤس اور کمبوڈیا میں تین ہزار امریکی اور جنوبی ویت نامی فوجوں کا صفایا کر دیا گیا ہے اور کوئی ۱۱۵ طیارے اور ۶۵ سے زیادہ ہیلی کاپٹر تباہ کر دیئے گئے ہیں۔ ان نقصان کے بارے میں جنوبی ویت نام کی فوجی کمان نے عذر یہ پیش کیا ہے کہ "کمبوڈیا اور لاؤس میں موسم خراب ہے" اور شمالی ویت نام کی طیارہ شکن توپوں کا جوابی حملہ شدت اختیار کر چکا ہے۔

پچھلے دنوں لاؤس پر سینکڑوں ہیلی کاپٹروں، طیاروں، ٹینکوں کی مدد سے جو حملہ کیا گیا اس کا مقصد ہوچی منہ روڈ پر قبضہ کر کے حریت پسندوں کی رسد کے تمام راستوں کو کاٹ دینا تھا لیکن بی بی سی کی اطلاع کے مطابق امریکہ کے محکمۂ فوجی جاسوسی کا عملہ پچھلے ایک ہفتے سے جنوبی ویت نام کی کئی بٹالین کا سراغ لگانے میں ناکام رہا ہے جو شاہراہ ہوچی منہ کاٹنے کے لئے گئیں تھیں۔ بی بی سی کا کہنا ہے کہ جنوبی ویت نام کی فوجی کمان ان بٹالین کی گمشدگی کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہے لیکن یہ بات اب تقریباً ہر امریکی اور جنوبی ویت نامی فوجی جانتا ہے کہ ان بٹالین کا صفایا ہو چکا ہے۔

ہند چینی میں امریکی جارحیت کے خلاف نہ صرف ساری دُنیا میں بلکہ خود امریکہ میں شدید ناراضگی پائی جاتی ہے امریکی عوام کی یہ ناراضگی ایک بغاوت کی سی شکل اختیار کر گئی ہے۔ ۱۹۷۰ء میں امریکی حکومت کے خلاف خونیں مظاہروں ہڑتالوں وغیرہ سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

یہ جنگ بازوں کی ناکامی کا سال ہے

۱۹۷۰ء کو نکسن حکومت کے خلاف امریکی عوام کی انقلابی جدوجہد کا سال کہا جا سکتا ہے۔ طلبا اور مزدوروں کے جلسوں، جلوسوں اور مظاہروں کے علاوہ امریکہ کے محنت کش عوام نے رجعت پسند امریکی اجارہ دار، سرمایہ داروں کی فوج اور پولیس کے خلاف مسلح جدوجہد کا حیرت انگیز ریکارڈ قائم کیا۔ نکسن نے برسر اقتدار آنے کے بعد معاشی استحصال، سیاسی دباؤ اور فوجی مداخلت کو اپنی پالیسی کی بنیاد بنا لیا ہے۔

پچھلے سال کمبوڈیا میں امریکی مداخلت کے خلاف امریکہ میں عوامی منافرت کا جو طوفان اٹھا تھا۔ اسے دبانے کے لئے نکسن حکومت نے کئی بار پولیس، نیشنل گارڈ حتیٰ کہ فوج تک کو استعمال کیا۔ تعلیمی ادارے بار بار بند کئے گئے اور سینکڑوں طالب علموں کو گرفتار کیا گیا۔ ۴ مئی سے ۱۶ مئی ۱۹۷۰ء تک امریکی پولیس کی فائرنگ سے بارہ امریکی ہلاک ہوئے جن میں کالے اور گورے دونوں شامل تھے۔ متعدد امریکی ریاستوں میں عوامی بغاوت کو کچلنے کے لئے فوج، بکتربند گاڑیاں اور ہیلی کاپٹر استعمال کئے گئے۔ جولائی ۱۹۷۰ء میں۔ اسبری پارک شہر اور نیوجرسی میں جس کی آبادی صرف ۲۰ ہزار ہے پولیس فائرنگ سے ۱۹۲ افراد شدید زخمی ہوئے۔ ترقی پسند انقلابی عناصر کو امن عامہ کے نام پر ہزاروں کی تعداد میں گرفتار کیا گیا ہے۔ اخباری رپورٹوں کے مطابق ۱۹۷۰ء میں نیویارک کی جیلوں میں گنجائش سے دگنے زیادہ قیدی رکھے گئے ہیں۔

امریکی پریس کے مطابق ایسے امریکیوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے جو اجارہ دار امریکی ٹولے کے خلاف مسلح جدوجہد اور بغاوت کو ناگزیر سمجھتے ہیں سات سو یونیورسٹیوں اور کالجوں کے علاوہ تین سو سے زیادہ اسکولوں کے طلبا نے کئی ہفتوں تک کلاسوں کا بائیکاٹ کیا اور ہند چینی میں امریکی مداخلت کے خلاف بڑے بڑے مظاہرے کئے۔ پتھروں، سوڈے کی بوتلوں اور دستی بموں سے پولیس کا مقابلہ کیا۔ اوہیو یونیورسٹی کے دس ہزار سے زیادہ طلبا نے پانچ ہزار مسلح نیشنل گارڈ سے ایک ہفتے سے زیادہ عرصے تک

نکسن
کی حفاظت
کے جتنے سخت انتظامات
کئے گئے ہیں، امریکہ کی
تاریخ میں اس کی
مثال نہیں
ملتی

جنگ کی اور آخر کار انہیں کیمپس سے بھگا دیا۔ جنوب میں الیناتھیس یونیورسٹی کے ۲۰ ہزار طالب علموں نے نکسن حکومت کی بھیجی ہوئی مسلّح فوج کو مار بھگایا۔ مغربی نیوز ایجنسیوں نے اس صورت حال کو انتہائی خطرناک قرار دیتے ہوئے تعلیمی اداروں کو سامراج دشمن طاقتوں کے "اڈوں" سے تعبیر کیا ہے۔

امریکی پریس نے بڑی تشویش کے ساتھ لکھا ہے۔ کہ ۱۹۷۰ء میں صرف نسلی فسادات کی تعداد سات سو تک پہنچ گئی ہے۔ یہ تعداد ۱۹۶۷ء کے مقابلے میں دوگنا زیادہ ہے۔ ۱۵ ستمبر ۱۹۷۰ء کو نیو آرلین اور ریو سیانا کے کالے شہریوں کے خلاف امریکی پولیس نے ہیلی کوپٹروں سے تشدّد اور بربریت کا مظاہرہ کیا۔ عوام نے پولیس تشدّد کے خلاف مسلّح جوابی کارروائیاں کیں۔ اس علاقے میں بارہ گھنٹے تک دست بدست جنگ ہوتی رہی جس میں بے شمار پولیس والے زخمی ہوئے۔ سیاہ فام آبادی کا نعرہ تھا۔ "تم ایک انقلابی کو تو قتل کر سکتے ہو لیکن انقلاب کو قتل نہیں کر سکتے۔" ہند چین میں امریکی جارحیت کے خلاف کیلی فورنیا کے ۲۰ ہزار عوام نے ۲۹ اگست ۱۹۷۰ء کو زبردست مظاہرہ کیا۔ رجعت پسند نکسن حکومت نے مظاہرین پر وحشیانہ لاٹھی چارج کیا جس سے بے شمار مظاہرین زخمی ہوئے۔ میکسیکو سٹی کے عوام نے نکسن حکومت کے خلاف مظاہروں میں کئی پولیس کاروں کے علاوہ بہت سے کارخانوں کو آگ لگا دی۔ شہر کا شرقی حصہ دھوئیں کے بادلوں میں چھپ گیا۔ ۹ ستمبر ۱۹۷۰ء کو واشنگٹن کے ٹاکوما علاقے میں اینگلو انڈین عوام نے پولیس کے خلاف آتشیں ہتھیاروں سے جنگ کی۔ اس علاقے کے عوام کا نعرہ تھا ایک اعلیٰ مقصد کے لئے جان دینا باعث فخر ہے۔!

۱۹۷۰ء کے سال میں امریکی مزدوروں کی جدوجہد میں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے۔ جنوری ۷۰ء سے اکتوبر تک مزدوروں کی ہڑتالوں سے مجموعی طور پر ۵ کروڑ دس لاکھ کام کے دنوں کا نقصان ہوا۔ یہ اضافہ ۱۹۶۹ء کے مقابلے میں ۴۹ فیصد زیادہ تھا۔ امریکی مزدوروں نے صرف ہڑتالیں ہی نہیں کیں بلکہ پولیس اور نیشنل گارڈ کے خلاف مسلّح جنگ بھی کی۔ ۲۹ اپریل کو اوہیا شہر کی انتظامیہ نے ٹرک ڈرائیوروں کی ہڑتال کو طاقت کے ذریعہ توڑنے کے لئے چار ہزار مسلّح نیشنل گارڈ بھجوائے، لیکن ہڑتالی مزدوروں نے دستی بم، رائفل اور سوڈے کی بوتلوں سے نیشنل گارڈ کا استقبال کیا۔ اوہیا کے گورنر نے بتایا کہ ایک طرح سے ہڑتالی مزدوروں نے حکومت کے خلاف کھلی جنگ کا آغاز کیا ہے۔

امریکی عوام نے نکسن حکومت کے خلاف نفرت کے اظہار کے طور پر کئی فوجی اداروں، عدالتوں، اور پولیس اسٹیشنوں پر بھی حملہ کیا۔ ایک اندازے کے مطابق جنوری ۷۰ء سے اکتوبر ۷۰ء تک امریکہ میں روزانہ اوسطاً دس کے حساب سے تین ہزار سے زیادہ بموں کے دھماکے ہوئے خاص طور پر فوجی تربیت گاہیں بم کے دھماکوں کا نشانہ بنیں۔ فوجی تربیت کے اداروں میں بم کے دھماکوں کا مقصد ہند چینی میں امریکی جارحیت کے خلاف نفرت کا اظہار ہے

ان واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے امریکی جنگ پرستوں کا ترجمان اخبار "نیوز اینڈ ورلڈ رپورٹ" لکھتا ہے کہ فوجی تربیت کے اداروں کے خلاف امریکی عوام کی نفرت میں پچھلے سال کئی سو گنا اضافہ ہو گیا ہے۔ وسکنسن یونیورسٹی کے فزکس ڈیپارٹمنٹ میں جہاں ایٹمی اور الکٹرونک ہتھیاروں کے سلسلے میں تحقیقاتی کام ہوتا ہے، ۲۴ اگست ۱۹۷۰ء کو زبردست دھماکہ ہوا۔ اس سے چھ منزلہ عمارت کی دو منزلیں تباہ ہو گئیں باقی چار کو سخت نقصان پہنچا۔ ایک الیکٹرانک کمپیوٹر جس کی قیمت کوئی گیارہ لاکھ ڈالر تھی تباہ ہو گیا اور ساری فائلوں اور اعداد و شمار کے ریکارڈ کو آگ لگ گئی۔ اس سے قبل اسی علاقہ میں ایک اسلحہ ساز فیکٹری اور اسلحہ کے گودام کو بھی تباہ کر دیا گیا ہیرلیڈ ٹریبون کی اطلاع کے مطابق ۱۹۷۰ء میں وفاقی حکومت کے دفاتر میں ۳۲۶ بم کے دھماکے ہوئے۔ یکم جولائی ۱۹۷۰ء کو انٹر امریکن ڈیفنس بلڈنگ کو دھماکہ سے اڑا دیا گیا یہ ادارہ لاطینی امریکہ کے عوام کے خلاف فوجی کارروائیوں کا ہیڈ کوارٹر مانا جاتا ہے۔ ۹ جون ۱۹۷۰ء کو نیو یارک پولیس کے نئے ہیڈ کوارٹر میں بم کا زبردست دھماکہ ہوا۔ جولائی کو صرف نیو یارک میں بم کے بارہ دھماکے ہوئے جن میں وفاقی حکومت کی ایک پانچ منزلہ عمارت بھی تباہ ہو گئی۔

امریکہ کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۶۹ء میں ڈیوٹی پر حاضر ۳۵،۲۰۲ سپاہیوں پر حملے کئے گئے۔ ۱۹۷۰ء میں حملوں کی تعداد میں اور اضافہ ہوا۔ نیو یارک میں صرف آٹھ ماہ میں ڈیوٹی پر متعین ۲ ہزار سپاہیوں پر حملے کئے گئے ان حملوں میں ۸۰۰ سپاہی ہلاک اور زخمی ہوئے۔ ۱۹۷۰ء کو پولیس پر حملوں کا سال بھی کہا جاتا ہے۔ نکسن، حکومت نے پولیس اور سرکاری عمارتوں پر حملوں کیخلاف سخت کارروائی کی دھمکی دی۔ وہائٹ ہاؤس کی حفاظت کے لئے ایسے الکٹرونک آلات نصب کئے گئے ہیں جو ہر قسم کے خطرے سے آگاہ کرتے ہیں۔ وہائٹ ہاؤس کے گرد سپاہیوں کی بارہ سے زیادہ چوکیاں قائم ہیں۔ امریکی اخبارات کا کہنا ہے کہ نکسن کی حفاظت کے لئے جتنے سخت انتظامات کئے گئے ہیں امریکہ کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ امریکی حکومت کے خلاف ہمہ گیر بغاوت اور قانون شکنی سے نہ صرف نکسن حکومت کی ملکی اور خارجہ پالیسیوں کے خلاف عوام کی نفرت کا اندازہ ہو جاتا ہے بلکہ امریکی عوام کے سیاسی شعور اور سامراج دشمنی کا بھی پتہ چلتا ہے۔

وائس چانسلر کے ساتھیو!

بادل کی چھاؤں میں

کتنے دِن آرام کرو گے؟

نمائندہ خصوصی

انجمن اساتذہ کے اجلاس (۹ فروری) میں جب وائس چانسلر صاحب سے استعفٰے کا مطالبہ کیا گیا تو ۱۴۳ ووٹ اس کی حمایت میں آئے اور محض چودہ اس کے مخالف تھے۔ جن میں ایک ووٹ میجر آفتاب حسن صاحب کا بھی تھا ہمارا خیال تھا کہ ڈاکٹر قریشی کے حاشیہ بردار دوستوں کے اس زبردست فرق سے سبق حاصل کریں گے۔ لیکن اچانک

آپ تحقیقات سے ڈرتے کیوں ہیں؟

..شیخ الجامعہ کی خوشامد کیا وقار کے منافی نہیں'

۱۱ فروری کے اخبارات میں ۲۰۸ اساتذہ کا ایک بیان شائع ہوا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ اساتذہ کے مطالبات تو جائز ہیں لیکن استعفٰے کا مطالبہ غلط ہے یہ مطالبہ اساتذہ کو واپس لے لینا چاہئیے اور ڈاکٹر قریشی سے گفت و شنید کے ذریعے مسائل حل کرنے کی کوشش کرنی چاہئیے۔ اس کے چند ہی دن بعد اطلاع ملی کہ ۵۵ اساتذہ نے انجمن اساتذہ جامعہ کراچی کی رکنیت سے استعفٰے دے دیا ہے اور ایک الگ انجمن بنانے کے لئے سرگرم ہیں۔ ۱۸ فروری کے روزنامہ ڈان میں صدر شعبہ انٹرنیشنل ریلیشنز کا ایک تفصیلی خط شائع ہوا۔

طلبار کے مفاد کے خلاف

آپ ڈاکٹر قریشی سے کیوں مل گئے؟

اساتذہ کی خدمت میں ہم چند گزارشات پیش کرنا چاہیں گے۔

آپ قوم کے استاد ہیں اور ہمارے لئے لائق احترام آپ سے ہم یہ توقع کرتے ہیں کہ خواہ کتنے ہی نامساعد حالات ہوں آپ اس پیشہ کا وقار قائم رکھیں گے اور یہ وقار دولت کی افراط اور افسرانہ اختیارات سے قائم نہیں ہوتا بلکہ امانت و دیانت، عالمانہ صداقت فکر و جرأتِ اظہار سے قائم ہوتا ہے جامعہ اس شہر کی سب سے بڑی درسگاہ ہے آپ لوگوں کو نہ صرف علمی لحاظ سے قوم کی قیادت کی ذمہ داری سونپی گئی ہے بلکہ اخلاقی اعتبار سے بھی آپ کو اس دیانت اور جرأت کا نمونہ ہونا چاہیئے جو صاحبان علم کے شایانِ شان ہے۔ حق کو حق باطل کو باطل آپ نہ کہیں گے تو اور کون کہے گا۔ آپ تو خود ظلم اور انصاف میں فرق قائم کرنا سکھاتے ہیں اور لوگوں کو صداقت کی تلاش اور انصاف کی حمایت کا سبق دیتے ہیں اگر آپ نے ہی بے انصافیوں سے سمجھوتہ کر لیا تو قوم اچھے اور برے میں تمیز کرنا کس سے سیکھے گی۔

ہمارے لئے یہی زخم بہت کاری ہے کہ اس دارالعلم کی سربراہ ایک ایسی شخصیت ہے جس نے دس سال ہر قسم کی بے ایمانی اور ریاکاری کو روا رکھ کر اس ادارہ کی نیک نامی کو تباہ کیا۔ اب خدا کا واسطہ آپ تو ان کے ہم زبان نہ بنیں۔ اس لئے کہ شیخ الجامعہ کا عہدہ تو آنی جانی بات ہے آپ کتنی ہی کوشش کر لیں۔ لیکن اس گزرنے والے بادل کی چھاؤں میں کتنے دن آرام کر سکیں گے۔ بالآخر آپ کا وقار سچی بات کا ساتھ دینے میں اور آپ کا مفاد اپنی رفیق اساتذہ برادری کی بھلائی میں مضمر ہے اور سب سے اہم حقیقت یہ ہے کہ آپ ایک عارضی شیخ الجامعہ کے ماتحت نہیں ہیں بلکہ اپنے طلباء کے استاد بھی ہیں۔ جو آپ سے ان تمام شفقتوں اور ہمدردیوں کی توقع رکھتے ہیں جو انہیں اپنے والدین سے ہیں۔ بلکہ مشرقی روایات نے تو انہیں یہ سکھایا ہے کہ استاد کا رتبہ والدین سے بھی بڑا ہوتا ہے یہ رتبہ کی بڑائی آپ کو اس محبت اور احسان نے دلوائی ہے جو ہر اچھے استاد کے دل میں اپنے شاگردوں کے لئے ہونا چاہیئے۔ مشہور استاد اور ماہر تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے کہا ہے کہ "کسی انسان سے ساری دنیا مایوس ہو جائے لیکن دو شخصیتیں مایوس نہیں ہوتیں ایک اچھا استاد اور ایک ماں" آپ اپنے شاگردوں کے لئے دوست، فلسفی اور رہنما کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ہم انتہائی دلی اذیت کے ساتھ اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ڈاکٹر قریشی کے دس سالہ دورِ امریت میں طلباء کو باوجود علمی صلاحیت کے داخلوں سے محروم کیا گیا۔ سیاسی نظریات کی بنا پر جامعہ کے دروازے ان پر بند کئے گئے ان کو غلط الزامات لگا کر نکالا گیا۔ لیکن آپ حضرات جو ڈاکٹر قریشی سے استعفٰے کے مطالبے پر اس قدر آزردہ ہیں کبھی ملول خاطر نہ ہوئے۔ کبھی آپ نے ڈاکٹر قریشی کو یہ سمجھانے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ تعلیمی ادارے بنیادی طور پر طلباء اور اساتذہ کے لئے قائم کئے جاتے ہیں تاکہ درس و تدریس کا کام باآسانی سرانجام دیا جا سکے۔ اور یونیورسٹی سے متعلق انتظامیہ کا یہ مقصد ہے کہ وہ اس درس و تدریس کے کام کے لیے انتظامی سہولتیں فراہم کرے۔ لیکن یہ کتنا بڑا مذاق ہے کہ آج وہی انتظامیہ استاد اور شاگرد کے درمیان دیوار بن کر حائل ہو گئی اور انتظامیہ کی مصلحتوں اور وقتی مفادات کی وجہ سے ہونہار طالب علم تعلیم سے محروم ہونے لگے اور آزادیٔ فکر کی وجہ سے ان اداروں سے نکالے جانے لگے جو فکری آزادی کے مرکز سمجھے جاتے ہیں ہمارا خیال یہ ہے کہ ان آمرانہ پالیسیوں سے تعلیمی ادارے کے قیام کا بنیادی مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ لیکن آپ کو اس علم کش رجحان پر کبھی تشویش نہ ہوئی۔ آپ کی تنخواہیں بڑھتی رہیں۔ ترقیاں ہوتی رہیں۔ آپ کے گھر سجتے رہے۔ خواہ علم کے چراغ بجھتے گئے۔ ایک آمر نے آپ کے طلباء کی ذہنی آزادی کا سودا چند عہدوں اور چند ٹکوں سے کر لیا اور آپ اس خسارے کے سودے پر کتنی خوشی سے تیار ہو گئے آپ نے ڈاکٹر قریشی کے ہر جھوٹ اور ہر مکر و فریب کا ساتھ دیا بلکہ ان کے دست و بازو ثابت ہوئے۔

چاپلوسی اور جلبِ اختیار

اسی طرح جب بھی انجمن اساتذہ نے کوئی مطالبہ کیا یا کوئی شکایت کی آپ نے ہمیشہ دل و جان سے اسکی مخالفت کی۔ جب اساتذہ نے یونیورسٹی آرڈیننس کی تنسیخ کے لئے جلوس نکالا تب بھی ہمیں یاد ہے کہ یہی نام اس تحریک کے مخالف تھے۔ حالانکہ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ یونیورسٹی آرڈیننس جیسے سیاہ قانون سے کسی کو کیا ہمدردی ہو سکتی ہے ڈاکٹر قریشی صاحب کی یونیورسٹی آرڈیننس سے محبت تو سمجھ میں آسکتی ہے۔ اس لئے کہ اسی قانون نے انہیں وہ لامحدود اختیارات دیئے جو ان سے پہلے کسی وائس چانسلر نے خواب میں بھی نہ دیکھے تھے۔ ان کی نامزد کردہ سنڈیکیٹ انہی کی منتخب کردہ سلیکشن کمیٹی اور اپنی دو کمیٹیوں کے ہاتھ میں

یونیورسٹی کے تمام فیصلے۔ اس طرح دراصل وائس چانسلر ہی سارے سیاہ وسفید کے مالک قرار پائے اور یہ دونوں کمیٹیاں محض اس لئے رہیں کہ قریشی صاحب کے خلاف غیر قانونی فیصلوں کو قانونی رنگ دیا جا سکے۔ لیکن اساتذہ جنکی تمام آزادی اس قانون نے سلب کر لی وہ آخر کس لئے اس کے حامی ہیں۔ علاوہ اس کے ہماری سمجھ میں تو کوئی وجہ آتی نہیں کہ آپ کے طبقہ کا مفاد اسی میں ہے کہ زیادہ سے زیادہ اختیارات محض ایک فرد واحد کے پاس رہیں تاکہ آپ ان کی چاپلوسی اور دربارداری کے ذریعے خوب فائدے حاصل کر سکیں ورنہ اگر منصفانہ مقابلہ ہونے لگے تو ظاہر ہے آپ کے لئے تمام دروازے بند ہو جائیں گے۔

تحقیقات سے کیوں ڈرتے ہیں؟

جب انجمن اساتذہ نے حکومت سے تحقیقات کی اپیل کی تو آپ کا سارا گروہ سراسیمہ ہو گیا۔ حالانکہ اگر یونیورسٹی پر انکوائری کمیٹی بیٹھتی تو وہ سب ہی اساتذہ کے واقعات اور حالات کی چھان بین کرتی، آپ کو خاص طور سے پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی اور انکوائری کبھی کسی فرد کے خلاف نہیں ہوتی، علاوہ بے ایمانوں کے اگر آپ کا نامہ اعمال صاف ہے تو آپ کو تحقیقاتی کمیٹی کو خوش آمدید کہنا چاہیئے تاکہ آپ کی صداقت واضح ہو جائے اس سے گھبرانا تو ظاہر ہے کسی کمزوری کی نشاندہی کرتا ہے۔

آپ نے فرمایا کہ گفت وشنید سے مسائل طے کرنے چاہئیں تو بتائیں انجمن اساتذہ اب تک کیا کر رہی تھی۔ جب جناب شیخ الجامعہ نہ صرف زبانی باتوں بلکہ تحریری معاہدے تک سے پھر جائیں تو پھر گفت وشنید کیا ہو گفت وشنید تو دس سال سے ہو رہی ہے آپ ہی کوئی طریقہ تجویز کرتے جس سے وہ مطالبات منوائے جا سکتے جن کی صداقت کا آپکو بھی اعتراف ہے۔ جو شخص اساتذہ کے خلاف انتقامی کارروائی کرنے پر بضد ہے (اس لئے کہ وہ موجودہ آرڈیننس کے نفاذ سے پچاس فیصدی لکچررس کی تنزلی ہو رہی ہے) جو تحریری معاہدوں سے پھر جائے اور جلد از جلد اپنی سازش کو عملی جامہ پہنانے کی یہ ترکیب کرے کہ اساتذہ چار دن کے اندر اندر جواب دیں ورنہ خاموشی کو رضامندی سمجھا جائے گا اس کا کیا علاج ہے اور ہمارے خیال میں استعفا طلب کرنا اور وہ بھی عزت نفس کا واسطہ دے کر بہت مہذب اور آئینی بات ہے ورنہ جب کسی مظلوم طبقہ کی دادرسی کے قانونی طریقے بند کر دیئے جاتے ہیں تو وہ لاقانونیت پر بھی اتر آتا ہے۔ دوسرے انصاف طلب کرنے والی ہر آواز جائز ہوتی ہے۔ ظلم کے خلاف احتجاج تو انسان کے ضمیر کو زندہ رکھنے کے لئے اشد ضروری ہے بے انصافیوں کی نشاندہی سے معاشرہ میں صحت مند رجحانات پیدا ہوتی ہیں اور انجمن اساتذہ بھی یہی سب کچھ کر رہی ہے۔

استعفے کا مطالبہ اور استاد کا وقار

۴۔ فروری کے اجلاس میں آپ لوگوں نے فرمایا کہ استعفے کا مطالبہ اساتذہ کے وقار کے منافی ہے اساتذہ کے وقار کی جب آپ بات کرتے ہیں تو ہمارے دل پر چوٹ پڑتی ہے۔ جامعہ میں اساتذہ کا وقار ہے کہاں کیا یہی اساتذہ کا وقار ہے کہ جس وقت ڈاکٹر قریشی چاہیں ۵۵ اساتذہ کو برطرف کر ڈالیں اور کوئی قانون دادرسی نہ کر سکے اساتذہ وائس چانسلر کے دفتر میں دربارداری کریں، ان کی جھوٹی سچی تعریفیں کریں۔ ان کے گھر پر حاضری دیں، ان کی خوشنودی کی خاطر طلبا کی اور اپنے ساتھی اساتذہ کی جاسوسی کریں۔ ان کی ہر غلط بات کی ہر جگہ تاویلیں پیش کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن ان کے وقار کا خیال آپ کو کبھی نہیں ستاتا شیخ الجامعہ تو پھر بڑی چیز ہے ہماری گنہگار آنکھوں نے تو آپ حضرات کو ان کے سیکرٹری کی خوشنودی کی خاطر سرگرداں دیکھا ہے اور رجسٹرار صاحب تو خیر آپ کے لئے بہت اہم ہستی ہیں کیا یہ اساتذہ کے وقار کے منافی نہیں کہ آپ درس وتدریس چھوڑ کر رجسٹرار صاحب کے دفتر میں ان کی دربارداری کرتے پائے جاتے ہیں عید بقرعید ان کے سلام کو حاضر ہوتے ہیں اور تو اور آپ میں سے کچھ لوگ ان کی صاحبزادی کی شادی میں بکرا پیڑی سے بکرے لاتے ہوئے اور مرچ مصالحہ کا حساب کرتے ہوئے دیکھے گئے ہیں اور تو اور قریشی صاحب کے ایک اور مصاحب ہلال زبیری صاحب جن کا یونیورسٹی سے کوئی تعلق نہیں، اساتذہ کے عروج وزوال کے معاملے میں خاصے بااختیار سمجھے جاتے ہیں اور اسی وجہ سے آپ لوگ ان سے تعلقات بڑھانے اور انہیں خوش رکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ خود یہ امر کہ آپ ہمیشہ وائس چانسلر کے ذرا سے اشارے پر دستخطی مہم پر نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ لوگ آپ کو قائل کرتے ہیں لیکن آپ اپنے ساتھیوں کی ساری لعن طعن برداشت کرتے ہیں۔ آپ کی خوشامدانہ روش کا واضح ثبوت ہے۔ آپ یہ مانتے ہیں کہ اساتذہ کے مطالبات جائز ہیں۔ آپ اس امر سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ شیخ الجامعہ صاحب بدعہدی کرتے ہیں۔ لیکن پھر بھی کسی دھاندلی پر احتجاج کی آپ میں جرأت نہیں اور ایک بدعہد آمر اور ایک ظالم افسر کی رضا کی خاطر آپ انجمن اساتذہ سے استعفے دے بیٹھے جو اساتذہ کے مفادات کے تحفظ کے لئے جدوجہد کر رہی ہے۔ آپ بتائیں کہ آپ کا یہ استعفے اور یہ بیان بازی کس حد تک آپ کے وقار کے مطابق ہے۔

۱۱۔ فروری کے شائع کردہ اخباری بیان پر جن ۲۸ اساتذہ کے دستخط ہیں ان میں سے دو تین کے سوا باقی تمام صدور شعبہ ہیں۔ ان میں سے اکثر کی کرسی صدارت تو محض قریشی صاحب کی مرہون منت ہے بقیہ بھی اپنے اختیارات میں وسعت کے لئے شیخ الجامعہ کے حلقہ بگوش ہیں۔ اس لئے کہ اختیارات کا مرکز شیخ الجامعہ کی ذات ہے جتنے وہ خوش ہوں گے اتنے ہی آپ کے اختیارات میں اضافہ کر دیں گے اور اگر اصول کی بات کی تو آپ کا حشر بھی پروفیسر الیاس یا صدر شعبۂ عربی ڈاکٹر محمد یوسف کا سا ہو سکتا ہے۔

ہمارے خیال میں درس وتدریس کا اور اساتذہ وطلبہ کو سب سے زیادہ نقصان صدور شعبہ اور شیخ الجامعہ کے ناپاک گٹھ جوڑ سے پہنچا ہے۔ شیخ الجامعہ جو دھاندلی چاہتے ہیں۔ صدور شعبہ سے کراتے ہیں اور صدور شعبہ اس کے بدلے میں جو مراعات چاہیں حاصل کرتے ہیں۔

دستخط کرنے والے اساتذہ کے انفرادی کردار کا پتہ تو آئندہ شمارے میں ملاحظہ کیجیے

احوالِ وطن

بقیہ ۵ سے آگے

جو سیاسی کارکن تشدد کا شکار ہیں ان میں گلگت کے ایک ایڈووکیٹ غلام مصطفےٰ بھی شامل ہیں اس کے علاوہ حال ہی میں قائم ہونے والی مشاورتی کونسل کے دو ارکان بھی گرفتار کر لئے گئے ہیں۔ جن کا قصور صرف یہ ہے کہ گلگت کے عوام کے لئے شہری حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں۔

سیاسی کارکنوں کی جائیدادیں ضبط کی جا رہی ہیں اور ان کے متعلقین کو طرح طرح سے تنگ کیا جا رہا ہے۔ گلگت بلتستان اسٹوڈنٹ آرگنائزیشن کے صدر نے انکشاف کیا ہے کہ پاکستان کے مختلف شہروں میں زیر تعلیم گلگت کے جو طلباء شہری حقوق کے لئے آواز اٹھاتے ہیں، ان کے والدین کو گلگت میں یرغمال کے طور پر گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ اور ان پر دباؤ ڈالا جاتا ہے کہ وہ اپنے فرزندوں کو ظلم و تشدد کے خلاف لب کشائی سے باز رکھیں۔ ورنہ ان کے "جرم" کی سزا خود برداشت کریں۔ طالب علم رہنما نے گلگت کو ایک وسیع جیل خانہ قرار دیا ہے اور حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ گلگت کی انتظامیہ کی عوام دشمنی کی عدالتی تحقیقات کروائے اور جلد سے جلد خوف و دہشت کی اس فضا کو ختم کر کے گلگت کے چھ لاکھ باشندوں کو سکون سے زندہ رہنے دے۔ گلگت کے عوامی رہنماؤں کا کہنا ہے کہ جب تک ایف سی آر جیسے رسوائے زمانہ قوانین یہاں نافذ رہیں گے گلگت کے عوام کو نوکر شاہی کے آہنی شکنجے سے نجات نہیں مل سکتی

نامہ و پیام

مزدوروں پر انصاف کی تمام راہیں بند ہو گئیں

اب ملوں پر علامتی قبضے کے سوا کوئی چارہ نہیں

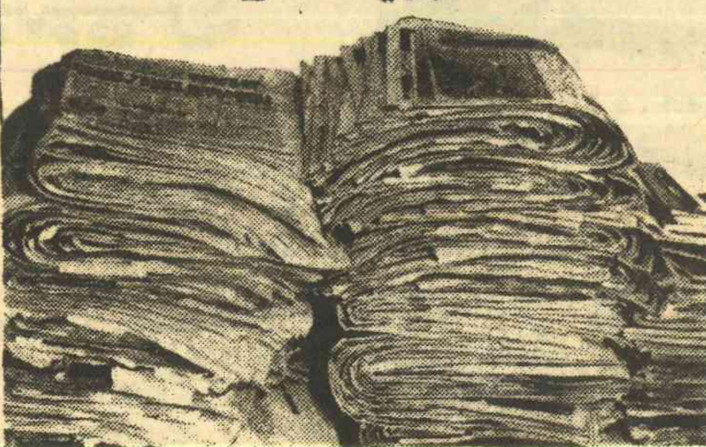
ولیکا ٹیکسٹائل کے مزدوروں پر پولیس کے لاٹھی چارج اور اندھا دھند گرفتاریوں سے ایک بار پھر یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی ہے کہ "ٹریڈ یونین کے مخالف اور مزدور دشمن" سرمایہ دار ابھی تک اپنے صنعتی اداروں میں یونین کو برداشت نہ کرنے کے بدنام زمانہ موقف پر مصر ہیں۔ یہ صرف ولیکا کے مالکان ہی نہیں بلکہ اس قماش کے مل مالک یہ کھیل بارہا کھیل چکے ہیں کہ وہ کسی نہ کسی طرح انتظامیہ کی مداخلت کا راستہ ہموار کر کے وقتی طور پر یونین کو توڑنے اور مزدوروں کے اتحاد کو منتشر کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

اگر انڈسٹریل ریلیشن آرڈیننس مجریہ سنہ ۱۹۶۹ء کے نفاذ سے اب تک کا جائزہ لیا جائے تو یہ بھیانک حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس قانون کے تحت ہونے والی ہر ہڑتال اتنی لمبی ہو گئی ہے جس کی مثال پاکستان کی تاریخ میں ملنا مشکل ہے۔ پھر یہ ہڑتالیں عام طور پر "لا اینڈ آرڈر" کا سہارا لے کر یا تو ناکام بنا دی گئی ہیں یا پھر انہوں نے خود ہی دم توڑ دیا ہے۔ مثال کے طور پر داؤد کاٹن ملز، فردوس کاٹن ملز، آلون انڈسٹریز، ایس۔ کے انڈسٹریز اور انڈس کیمیکل کی ہڑتالیں مالکان کے سوچے سمجھے منصوبہ اور انتظامیہ کی مداخلت کی زندہ مثالیں ہیں۔

اب ایک بار پھر ولیکا میں یہ کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ ولیکا گروپ آف انڈسٹریز کے مالکان یونین دشمن کے لئے بدنام ہیں۔ مذکورہ صنعتی ادارہ کے مزدور مغربی پاکستان کے وہ بدقسمت مزدور ہیں، جنہیں سب سے کم تنخواہ، بونس اور دوسری سہولتیں ملتی ہیں۔ اس پر ستم یہ ہے کہ جب بھی ولیکا کے کسی کارخانے کے مزدوروں نے یونین بنانے کی کوشش کی ہے اسے کسی نہ کسی طرح توڑ دیا گیا۔ ۱۹۶۹ء میں ولیکا ٹیکسٹائل ملز کے مزدوروں نے متحدہ مزدور فیڈریشن کی سرکردگی میں بیش بہا قربانیوں کے بعد مالکان کو یونین سے ایک معاہدہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا لیکن اس پر ابھی تک عملی درآمد نہیں ہو سکا۔ اس سلسلہ میں یونین نے متعدد بار منتظمین کی توجہ مبذول کرائی، محکمہ محنت سے خط و کتابت کی لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ اب مزدوروں کے سامنے دو ہی راستے تھے کہ وہ اس سلسلہ میں یا تو لیبر کورٹ میں مقدمہ دائر کر دیں یا راست اقدام کریں۔ جہاں تک سندھ لیبر کورٹوں کا تعلق ہے اس کی پوزیشن یہ ہے کہ سندھ لیبر کورٹ نمبر ۱ سنہ ۱۹۶۹ء اور سنہ ۱۹۷۰ء میں تقریباً بند رہا۔ محترم چیئرمین لیبر کورٹ نمبر ۱ کے تبادلہ کے بعد اب تک کسی دوسرے جج کا تقرر نہیں ہو سکا۔ چنانچہ اس کورٹ میں دائر شدہ تمام صنعتی تنازعات ہنوز معلق ہیں۔

سندھ لیبر کورٹ نمبر ۲ میں آجکل تقریباً ایک ہزار سے زیادہ صنعتی تنازعات اور متعلقہ درخواستیں زیر سماعت ہیں۔ یہ بات عملاً ناممکن ہے کہ مقدمات کی اس قدر کثیر تعداد کا فیصلہ ایک کورٹ جلد از جلد کر سکے۔ یہ بات تمام مزدوروں کو معلوم تھی اور ہے۔ جہاں تک راست اقدام کا تعلق ہے، اس سلسلہ میں سوائے ہڑتال کے اور کوئی اقدام "قانونی" نہیں اور جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، سنہ ۱۹۷۰ء میں ہونے والی ۹۰ فیصد ہڑتالیں ناکام ہو چکی ہیں۔ کیونکہ اس ہوشربا گرانی کے دور میں مزدور تنظیمیں کسی طرح بھی لمبی ہڑتالوں کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔

لامحالہ مزدور اس نتیجہ پر پہنچے کہ ایسی صورت میں لیبر کورٹ یا ہڑتال کی بجائے "ملوں پر" علامتی قبضہ کر کے مالکان کو گفت و شنید اور مصالحت کے لئے مجبور کر دیا جائے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مغربی پاکستان یا کراچی کے صنعتی اداروں میں جہاں کہیں بھی اس دوران میں "گھیراؤ" یا قبضہ ہوا ہے وہاں توڑ پھوڑ بالکل نہیں ہوئی۔ اور یہ بات قدرتی ہے کہ جب عدالت اور ہڑتال کے حربے ناکام ہو جائیں تو مزدور دوسرے مؤثر حربے استعمال کریں گے۔ ولیکا ٹیکسٹائل ملز کے مزدوروں نے بھی ایسا ہی کیا ہے اور مذکورہ بالا حالات کے ماتحت یہ ایک



جائز ردِّ عمل کے سوا اور کچھ نہیں۔

اس لئے سندھ متحدہ محاذ، مزدور کونسل۔ حکومت سندھ اور پیپلز پارٹی کے رہنماؤں سے مطالبہ کرتی ہے کہ :۔

۱۔ ولیکا گروپ آف انڈسٹریز کے منتظمین کی مخالف ٹریڈ یونین اور مزدور دشمن روش کے خلاف اس انڈسٹریز کے قیام کے بعد سے اب تک کے حالات کی غیر جانبدارانہ تحقیقات کرائی جائے۔

۲۔ ہر قانونی ہڑتال کے تیس دن ختم ہونے کے بعد معاملہ لیبر کورٹ کے سپرد کرنے کے لئے دونوں میں سے کسی ایک پارٹی کو اختیار دیا جائے۔

۳۔ سندھ لیبر کورٹوں کی تعداد کم از کم چار ہونی چاہئے نیز ان میں مستقل جج صاحبان کا تقرر ہونا چاہیے۔

۴۔ تمام معروف ٹریڈ یونین حربوں کو مثلاً ہڑتال کے بعد پکٹنگ اور علامتی قبضہ کو قانونی شکل دی جائے۔

۵۔ ٹریڈ یونین سرگرمیوں کے خلاف پولیس یا انتظامیہ کی مداخلت غیر قانونی قرار دی جائے۔

۶۔ تمام پاکٹ یونینوں کے رجسٹریشن منسوخ کئے جائیں۔

۷۔ ولیکا ٹیکسٹائل ملز کے تمام گرفتار شدہ کارکنان کو غیر مشروط طور پر رہا کیا جائے۔

۸۔ ولیکا ٹیکسٹائل ملز اور ایسے تمام صنعتی اداروں میں مزدوروں کے تنازعات حل کرانے کے (جو طویل عرصہ سے ہڑتال پر ہیں) ایک سہ رکنی بااختیار مصالحتی کمیٹی بنائی جائے۔

سرفراز احمد خاں۔ آفس سیکرٹری۔ سندھ متحدہ مزدور کونسل۔ کراچی

زبان کا مسئلہ اور ایک ضروری وضاحت

لیل و نہار ۱۲ر فروری میں نامہ و پیام کے زیرِ عنوان واجد یار محمد صاحب نے "ان سطور کے راقم پر" سراسر جانبداری" کا الزام عاید کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں" ون یونٹ سے پہلے سندھی زبان سندھ یونیورسٹی کی کاروباری اور اندرونی خط و کتابت کی زبان تھی لیکن ون یونٹ کے بعد ایک منظم سازش کے تحت سندھی زبان کو نظر انداز کر کے آہستہ آہستہ اس کی جگہ اُردو زبان کو مسلط کر دیا گیا"۔

مجھے افسوس ہے کہ یہ بیان دُرست نہیں۔ بہتر ہوتا کہ وہ اس کی تصدیق سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر یا رجسٹرار سے کر لیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جامعہ سندھ کے اندرونی، بیرونی کاروبار کی زبان شروع سے انگریزی رہی ہے۔ یہاں اُردو کبھی مُسلّط نہیں کی گئی اور سندھی کو حال ہی میں اختیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

جہاں تک ان کا یہ اعتراض ہے کہ "یہ کہاں کی ترقی پسندی ہے کہ نواب مُظفر جیسے متعصب آدمی کی تحریک کی ظاہری مخالفت اور اندرونی حمایت کر کے سندھی زبان کے خلاف صفحہ کے صفحہ سیاہ کئے جائیں" تو عرض ہے کہ اگر آپ "لیل و نہار" کے گذشتہ چھ سات شماروں پر نظرِ ثانی کی زحمت کریں تو آپ اپنے الزام پر نظرِ ثانی کرنے کے لیے خود ہی مجبور ہوں گے۔ راقم الحروف نواب مظفّر کی منفی سیاسی روش پر کڑی نکتہ چینی کر چکا ہے۔ ابھی دو تین ہفتے قبل بھی یہ لکھا جا چکا ہے کہ نام نہاد اسلام پسندی کے بعد 'مہاجروں' کے خدائی فوجدار نواب مظفّر کے پیٹ میں اب اُردو کا درد اُٹھا ہے" میں ظاہری مخالفت اور اندرونی حمایت کو گھناؤنی منافقت تصوّر کرتا ہوں۔ میں نے سندھی زبان کے خلاف "صفحہ کے صفحہ سیاہ کرنا" تو درکنار ایک سطر بھی مخالفت میں نہیں لکھی۔ میرے نزدیک سندھی پاکستان کی ایک محترم قومی زبان ہے۔ میرے خیال میں اُردو یہاں درآمد نہیں کی گئی بلکہ پہلے سے موجود تھی۔ اس کی گواہی وہ بزرگ مجھ سے بہتر طور پر دے سکتے ہیں جو یہاں قیامِ پاکستان سے پہلے سے آباد چلے آ رہے ہیں۔ تاہم آج کا سندھ ۱۹۴۷ء سے پہلے کا سندھ نہیں ہے۔ میں قوموں کے حقِ خود اختیاری کا حامی ہوں لیکن قومیں کثیر اللسانی یا ذو لسانی بھی ہوا کرتی ہیں۔ ادھوری صداقت مُضر ہوتی ہے۔ سائنسی فکر و عمل کی روشنی میں حقیقت پسندی سے بھی کام لیجئے۔

احمد الطاف۔ حیدرآباد

کلیم الحسن نقوی پرنٹر، انیس ہاشمی پبلشر انجمن پریس میں چھپا کر دفتر لیل و نہار عظمت منزل ۱۱/ج سنٹرل کمرشل ایریا پی ای سی ایچ ایس کراچی ۲۹ سے شائع ہوا۔

THE LAILO-NAHAAR WEEKLY, KARACHI. R. L. No. S. 2744

7. MARCH. 1971



Lailo Nahaar Newsweekly Registered as a Newspaper with the Post Office in United Kingdom.